September
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

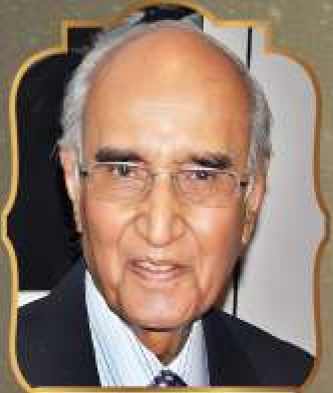

مشتاق احمد یوسفی
September
04

فاطمہ ثریا بجیا
September
01

سالگرہ مبارک

ثمینہ راجہ
September
11

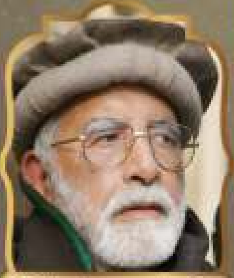

اجمل خٹک
September
15

ظفر اقبال
September
27

اشرف جاوید
پیمان سے خالی شام

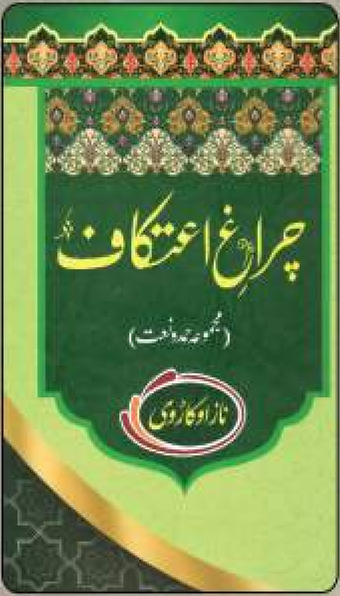
چراغِ اعتکاف
(مجموعۂ حمد و نعت)
ناز اوکاڑوی

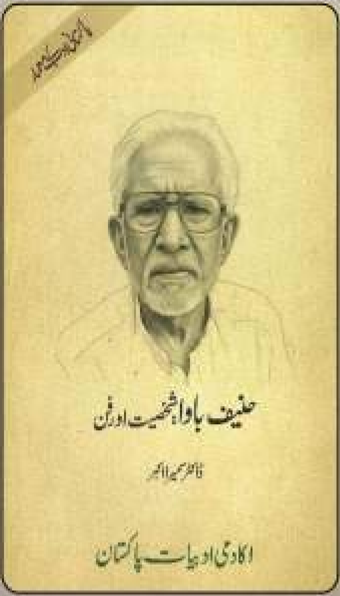
حنیف باوا: شخصیت اور فن
اکادمی ادبیات پاکستان

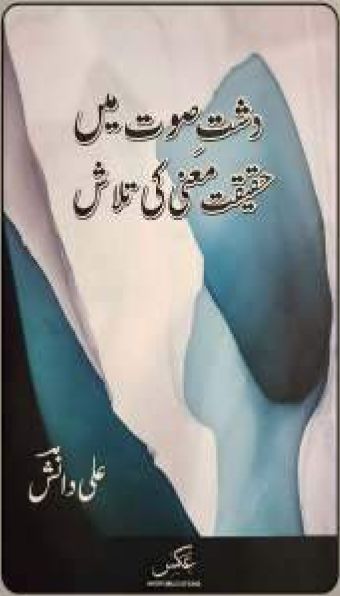
وحشتِ صوت میں
حقیقتِ معنی کی تلاش
علی دانش

شہرت

بے چہرہ ہو ، تو ، سنگ کی سل میں چھپے رہو
پھر یہ نقاب ، رُخ سے ہٹایا نہ جائے گا

تم سنگ ہو تو چادرِ گل میں چھپے رہو
بے چہرہ ہو ، تو ، سنگ کی سل میں چھپے رہو
خوشبو کی طرح غنچۂ دل میں چھپے رہو
شہرت کا بوجھ تم سے اُٹھایا نہ جائے گا!

بے چہرہ ہو ، تو ، سنگ کی سل میں چھپے رہو
پھر یہ نقاب رُخ سے ہٹایا نہ جائے گا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9

■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5

■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk

UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - ستمبر 2026 - شمارہ نمبر: 9

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیگم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: محترمہ فاطمہ ثریا بجیا، جناب مشتاق احمد یوسفی
محترمہ ثمینہ راجہ، جناب اجمل خٹک، جناب ظفر اقبال

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد فارمیسی کالج اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، علی رضا اشرف نقوی، سید تحسین گیلانی	7 تا 11
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، اعجاز کنور راجہ، شاہ محمد سبطین شاہجہانی خاور اعجاز، محمد لیسین قمر، اکرم ناصر، احمد جلیل، رضا اللہ حیدر نذر عابد، علی رضا، سرور حسین نقشبندی، مظہر امام، تصور اقبال اشرف نقوی، نبیل احمد نبیل، اسلم سحاب ہاشمی	12 تا 28
3	سوز و سلام	عون الحسن غازی	29 تا 30
4	عقیدت	اعجاز کنور راجہ، مرزا آصف رسول	31 تا 32
5	ہائیکو	آفتاب خان	33 تا 34
6	وطن کے لیے	سید ریاض حسین زیدی، شاہ محمد سبطین شاہجہانی احمد جلیل، مرتضیٰ سید	35 تا 39
7	رباعیات	محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	40 تا 41
8	قطعات	خاور اعجاز	42
9	افسانے	محمد حمید شاہد، حامد یزدانی، نجم رضوی، کلیم خارجی، عمران شاہد علی حسن اویسی، بابر امین ابر، کنز ٰی خالق، خالد نذیر، نوید عاقل	43 تا 90

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی ،اعجاز کنور راجہ ، خاور اعجاز نسیم سحر، محمد انیس انصاری، سرور فرحان ،شریف ساجد راحت سرحدی، اجمل اعجاز، عقیل رحمانی، احمد جلیل، مسعود احمد سعد اللہ شاہ، اکرم ناصر، قیوم طاہر، افتخار شاہد، افتخار الحق ابو طالب انیم، محمد سلیم ساگر، ہمایوں پرویز شاہد، شفیق آصف اعجاز دانش، شاہنواز زیدی، شوکت محمود شوکت رضا اللہ حیدر، افروز رضوی، خالد و انور، رخشندہ نوید، عاصم اعجاز علی رضا احمد، واصف سجاد، علی حسین عابدی، ظہور چوہان اشرف نقوی، تنویر قاضی، مظہر امام، عابد خان عابد اصغر علی بلوچ، نبیل احمد نبیل، اویس الحسن، شب طراز نیاز جیراجپوری، فوزیہ تبسم، سعید شباب، شاہ روم خان ولی جیا قریشی، کوکی گل، میتھیو محسن، عابد معروف مغل غضنفر مہدی، عابد رضا، کرن گوندل، شاہین فصیح ربانی اویس اکبر، علمدار حسین ،ارشد محمود ارشد، محمد اشفاق بیگ دلشاد رانا، الماس شبی، نوید عاجز، احمد نواز، اسلم سحاب ہاشمی	91 تا 153
11	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، نثار ترابی، اظہر رضوی جمیل احمد عدیل، اعجاز روشن، علی رضا علی ارمان، رومانہ رومی محمد آصف مرزا، محمد اصغر کاظمی، عباس علی شاہ ثاقب طلحہ غفور، سعید اشعر، باسم ہارون	154 تا 218
12	طنز و مزاح خاکہ	ہمایوں خان، تنویر قاضی	219 تا 224
13	نظمیں	خالد احمد، خورشید رضوی، جلیل عالی، نسیم سحر، اوریا مقبول جان نثار ترابی، مسعود احمد، طلعت شبیر، سرفراز تبسم، تنویر قاضی رخشندہ نوید، سمیع اللہ عرفی، امجد بابر، نائلہ راٹھور زریاب گل، محمد عبداللہ، خالق آرزو	225 تا 241

حمد

رب کریم! تیری عنایت ہے بے بہا
بے خانماں کو گھر جو دیا تو نے خوش نما

بے مثل کیسا حق رفاقت ہوا ادا
دیکھے نہ مصطفیٰؐ کہیں تجھ سے کبھی جدا

ہریالیوں نے روح جہاں کو سجا دیا
شاداب تیرا گھر ملا ، گنبد ملا ہرا

دکھلائی تو نے راہ جو ہے راہ مستقیم
سمجھا دیا کہ کام نہ ہرگز ہو ناروا

بے رہ روی کی راہ میں دیوار کھینچ دی
پورا ہوا چراغ ہدایت کا مدعا

تو چاہے کائنات اندھیروں میں جا گھرے
تیرا کرم ہے تو نے اندھیروں کو دی ضیا

عہد ستم میں غیرت ایماں خطر میں تھی
ہے تیرا فیض تو نے مدینہ بسا دیا

غیظ و غضب سے تیرے ہیں کفار دم بخود
شرک خفی جلی کو جہاں سے مٹا دیا

میں ہوں ریاض اس کی خدائی کا معترف
میرا سر نیاز ہے سجدے میں جا گرا

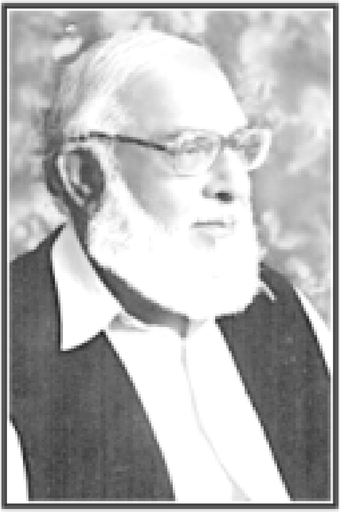

سید ریاض حسین زیدی

حمد

ہر منظر میں، پس منظر میں، تو ہی دکھائی دیتا ہے
ہر سُو تو ہی بول رہا ہے، تو ہی سنائی دیتا ہے

یوں لگتا ہے، تو نے ڈھانپ لیا ہے اپنی چادر میں
آدھی رات کو جب کوئی رو رو کے دُہائی دیتا ہے

مجھ سا تاجر کوئی نہیں ہے، تجھ سا آجر کوئی نہیں ہے
تو ہی برائی کے بدلے میں سدا بھلائی دیتا ہے

ہر رَستہ، ابلیس کا رَستہ، دوزخ کا گمراہی کا
سیدھے رَستے کی جانب، تو راہنمائی دیتا ہے

وہ دِن، جب ہر ایک زباں پر مُہر لگا دی جائے گی
دیکھنا، تب ہر عُضوِ بدن کس طرح گواہی دیتا ہے

محشر کے دن، فیصلہ مالک! تیرے ہاتھوں میں ہوگا
کِس مجرم کو سزا سُنائے، کِسے رِہائی دیتا ہے

کُھلتے جاتے ہیں انساں پر وہ مخفی اَسرار و رَموز
جن پر میرا رَب اپنے بندوں کو رَسائی دیتا ہے

شُکر ہے، میں بھی تیرے اُن ادنیٰ بندوں میں شامل ہوں
جن کو تو، توفیق و سعادتِ مدح سرائی دیتا ہے

سورۂ یوسف پڑھ کر میں سکتے میں آ گیا، جانِ انیس!
دیکھو! کیسے بھائی کو وہ کیسے بھائی دیتا ہے

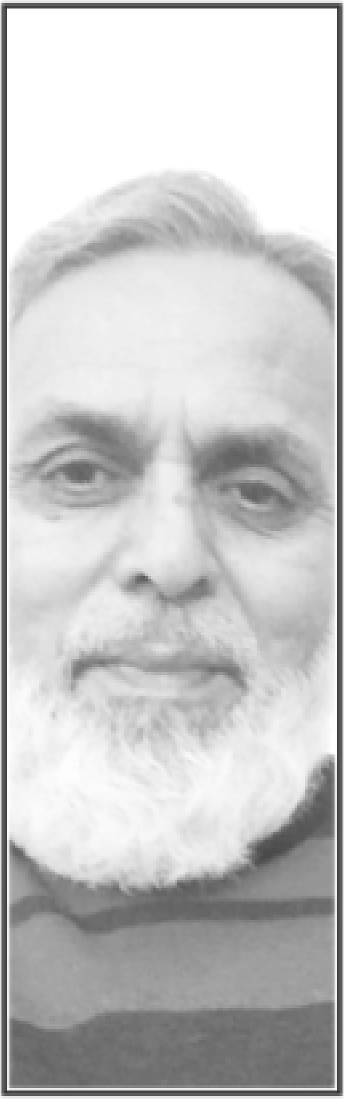

محمد انیس انصاری

حمد

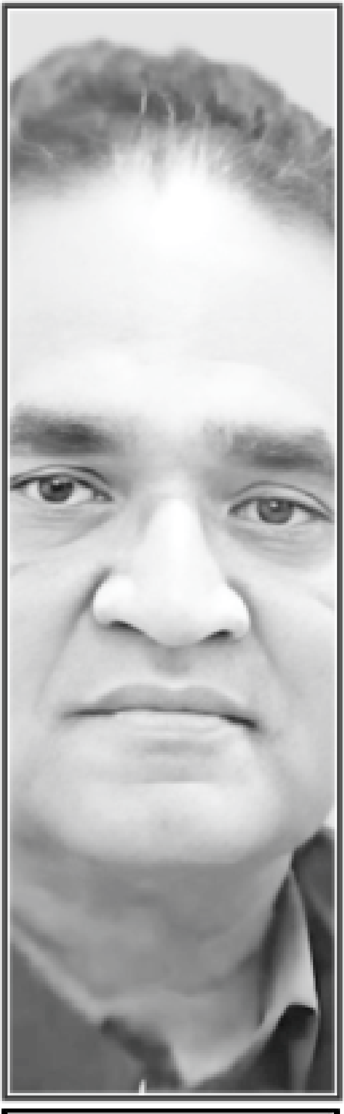

علی رضا

یہ زمیں تیری آسماں تیرا
کیا نہیں رب دو جہاں تیرا

تو ہے لوحِ یقیں پہ حرفِ ابد
کیسے مدھم پڑے نشاں تیرا

تجھ سے کیا کیا مجھے عطا نہ ہوا
شکر ہے ربِ لامکاں تیرا

تیرے الطاف کیسے بھول سکے
یہ گنہگار ناتواں تیرا

سلسلہ ہے عنایتوں کا تری
ہر زمانے میں بے کراں تیرا

میرا سارا سفر تری جانب
میری منزل ہے آستاں تیرا

اپنے حفظ و اماں میں رکھتا ہے
غم نصیبوں کو سائباں تیرا

حمد

اے ربِ کون و مکاں خود سے آشنائی دے
اُتر وجود پہ میرے، مجھے دکھائی دے

میں تیرا بندۂ عاصی، تُو میرا مالک ہے
میں تیری راہ چلوں ایسی رہنمائی دے

ترے علاوہ نہیں کوئی آسرا میرا
مجھے خدایا فقط اپنی ہی گدائی دے

تری عطا سے ہی میرے چراغ روشن ہیں
ترے کرم سے ہی سب کچھ مجھے سُجھائی دے

جو تُو قریب ہے میری ہر اک رگِ جاں کے
مرا بھی حق ہے مجھے خود تلک رسائی دے

مری ہے اِتنی تمنا کہ مجھ سے راضی رہ
سو ہر طرح کے گُنہ سے مجھے رہائی دے

ہوں اپنے لفظوں کی توقیر کا تمنائی
کرے جو دل پہ اثر ایسی خوش نوائی دے

ترے نبی کی اطاعت ہو میری حرزِ جاں
یہی دعا ہے سدا خیر اور بھلائی دے

تُو خود جمیل ہے اور تجھ کو ہے جمال پسند
کچھ اپنے حُسن سے مجھ کو بھی خوش نمائی دے

غمِ زمانہ تجھے جب بھی تنگ کریں اشرف
تُو چھوڑ غیر کو، بس مولا کی دُہائی دے

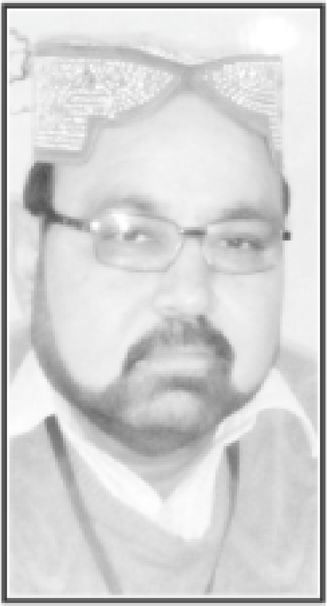

اشرف نقوی

حمد

ہم کو ہے تیرا سہارا، دو جہاں کے بادشاہ
کون تجھ بن ہے ہمارا، دو جہاں کے بادشاہ

مشکلیں سب ٹل گئیں پھر، یا رحیم و یا کریم
جس نے بھی رو رو پکارا، دو جہاں کے بادشاہ

رحمتیں اتنی ہیں تیری غم بھی اب تو غم نہیں
تو نے تو ہر غم سنوارا، دو جہاں کے بادشاہ

معجزہ ہے نہ کرامت، بس ہمیں اک مل گیا
تیری رحمت کا اشارا، دو جہاں کے بادشاہ

ڈوبنے والے نے جب بھی، دل سے تجھ کو دی صدا
سامنے تھا پھر کنارا، دو جہاں کے بادشاہ

تیری قدرت کا نظارہ، دہر کی ہر شے میں ہے
تو ہی امبر، تو ستارا، دو جہاں کے بادشاہ

کون دیتا ہے سہارا، جب زمانہ درد دے
تجھ کو بس دل نے پکارا، دو جہاں کے بادشاہ

خالقِ اکبر میں تیری عظمتوں پہ ہوں نثار
بندہ ہوں میں بس تمہارا، دو جہاں کے بادشاہ

سید تحسین گیلانی

نعتؐ

وہؐ بحرِ خُلق ہے، شہیرِ خبر ہے
ہمارا راہبر خیرُ البشر ہے

زمینوں اور زمانوں کی حقیقت
اسیؐ کی نسبتوں سے معتبر ہے

وہیؐ معیارِ محکم، حرفِ فیصل
وہ جس جانب ہے سچائی اُدھر ہے

ذرا اُسؐ کی نگاہوں سے گرا تو
یہ سمجھو کل جہاں زیر و زبر ہے

اسیؐ کی نور بوچھاروں کے دَم سے
نظر میں نم دعاؤں میں اثر ہے

اُسیؐ کے دھیان کی زرخیزیوں سے
شجر دل کا خزاں میں با ثمر ہے

کمی اُسؐ سے محبت میں نہ رہ جائے
ہمیں اُسؐ کے خدا کا بھی تو ڈر ہے

کہیں ہم خود کو کیسے اُس کا پیرو
ندامت سے دل اپنا تر بتر ہے

زمانے چاہئیں اُسؐ کی ثنا کو
اور اپنی عمر عالی مختصر ہے

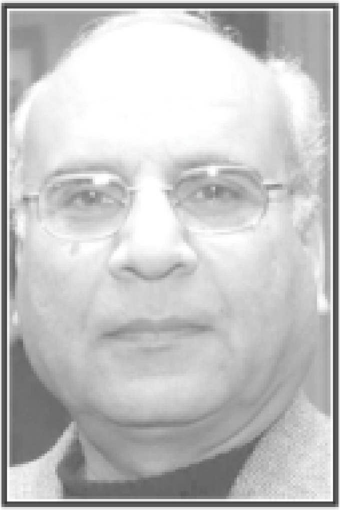

جلیل عالی

نعتؐ

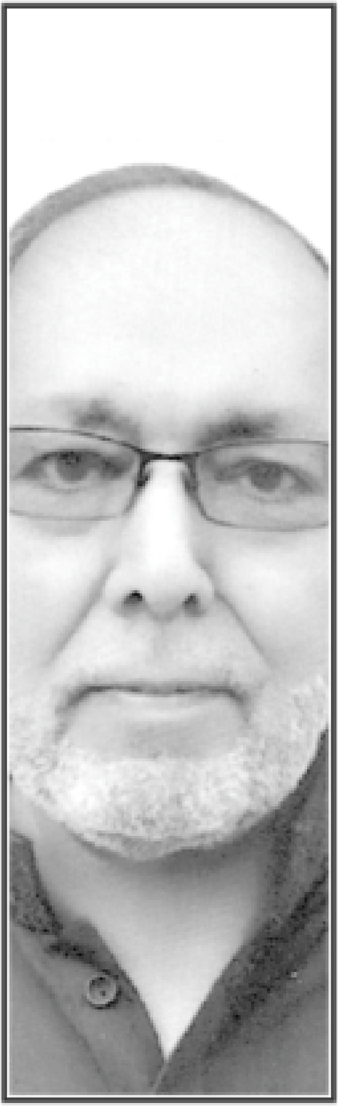

نسیمِ سحر

لبوں پہ حُبِ نبیؐ کا وفور بولتا ہے
تو میری آنکھوں سے آبِ طہور بولتا ہے

وہاں کی روشنیاں بھی کلام کرتی ہیں
سُنو بغور، وہاں اُنؐ کا نُور بولتا ہے

اِک ایک لفظ سُنا جاتا ہے وہاں پہ ضرور
جو سجدہ کر کے دلِ ناصبور بولتا ہے

جو بھیجا جائے درود و سلام آقاؐ پر
عجیب رنگ میں کیف و سرور بولتا ہے

وہاں تو اس کے معانی بھی کھلتے جاتے ہیں
ابھی جو آدمی بین السطور بولتا ہے

مدینے جاتا ہے زائر تو اس کا جذبۂ عشق
نبیؐ کے شہر میں نزدیک و دُور بولتا ہے

نبیؐ کے در پہ جنوں کا کہاں گزر ہے نسیمؔ؟
وہاں تو سر کو جھکا کر شعور بولتا ہے

نعتؐ

خواب جو دیدۂ بیدار میں آ جاتے ہیں
"قریۂ مدحتِ سرکار میں آ جاتے ہیں"

نیتِ شوق میں ہوتا ہے مدینے کا سفر
اور قدم وقت کی رفتار میں آ جاتے ہیں

سایۂ گنبد و مینار میں آنے والے
اک عجب حلقۂ انوار میں آ جاتے ہیں

آپؐ کے عشق میں ہم جیسے شبوں کے پالے
اک مقامِ سحر آثار میں آ جاتے ہیں

ان کی بس آپؐ کی رحمت پہ نظر ہوتی ہے
وہ تہی دست جو بازار میں آ جاتے ہیں

حسنِ کردار سے اندازہ ہوا خالق کے
رنگ کتنے کسی شہکار میں آ جاتے ہیں

سر پہ آ جاتا ہے سچائی کا سورج آخر
سائے واپس در و دیوار میں آ جاتے ہیں

ہر طرف وجد میں ہوتی ہے بہارِ طیبہ
گل کے اوصاف کنورؔ خار میں آ جاتے ہیں

اعجاز کنور راجہ

نعتؐ

مرحبا فخرِ کون و مکاں، حبذا رشکِ ماہِ مبیں
دل میں یادوں کا ہے آسماں، چاند تارے نظر میں مکیں
آپؐ کا دَر کرم زار ہے، ذرّہ ذرّہ ضیا بار ہے
آ گیا جو بھی تیرہ جبیں، بن گیا رشکِ ماہِ مبیں

سبز گنبد کی وہ طلعتیں جالیوں کی حسیں رنگتیں
دُور جتنی نگاہوں سے ہیں میرے دل سے ہیں اتنی قریں
آپؐ ہیں بابِ لطف و عطا، آنے والا نہ خالی گیا
ایک 'ہاں' ہے لبوں پہ رواں، اِک 'نہیں' ہے جو لب پر نہیں

آپؐ ہیں ماہتابِ عطا، آپؐ ہیں آفتابِ سخا
روشنی روشنی آسماں، چاندنی چاندنی ہے زمیں
ہر طرف سیلِ انوار ہے، شہر کا شہر گلزار ہے
صبح زرّیں ہے جنّت نشاں، شام رنگیں ہے خُلدِ بریں

کیا حجاز و عرب کیا عجم، آپؐ سے ہیں سبھی محترم
آپؐ کے دَم سے سب کا بھرم، آپؐ سلطانِ کُل عالمیں
مانا سبطین ہے پُر خطا، ہے گدا و گدا آپؐ کا
اس پہ چشمِ کرم یا نبیؐ صدقۂ زینتِ عابدینؓ

باغِ طیبہ کے وہ روز و شب ذہن پہ نکہت افشاں فضا یا رب
دلربا دلربا ہے فضا، دلنشیں دلنشیں ہے زمیں

شانِ عظمت پہ شاہد خدا، آپؐ سے پُر ضیا، ہر فضا
ارضِ طیبہ ہے گوہر فشاں، فرشِ بطحا فلک سے حسیں

آپؐ ہیں شاہِ ارض و سما، بادشاہِ سخا، بر ملا
ہر زمیں آپؐ کی سلطنت، ہر فلک آپؐ کا ریزہ چیں

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

نعتؐ

خدا کا راستہ ہیں اور دلوں کی منزل ہیں
حضورؐ، ختمِ رسل، منزلوں کی منزل ہیں

جہاں میں خلق کا معیار آپؐ کی گفتار
ازل سے تا بہ ابد چھلتی ہوئی مہکار

نظام کون و مکاں میں مثیل کوئی نہیں
حضورؐ جیسا جلیل و جمیل کوئی نہیں

وہ نورِ حق جو عیاں آپؐ کے حضور ہوا
کرن کرن وہی انسان کا شعور ہوا

محبتوں کا شجر سایہ دار آپؐ سے ہے
خزاں رتوں میں اُمیدِ بہار آپؐ سے ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نطق کی ہر کونپل سے پھوٹیں پو بن کر افکار
رنگ مثال، بکھر، اے نافۂ آہوئے تاتار

نعتؐ

بارگہِ درود سے اذنِ ثنا عطا ہوا
اُنؐ کے حضور پیش جو سائلِ بے نوا ہوا

اُنؐ کے حریمِ پاک سے آیا ہوں کب میں لوٹ کر
دل ہے رہِ مدینہ میں اب بھی کہیں پڑا ہوا

ثور و حرا ہیں سامنے، کوہِ صفا ہے سامنے
جلووں کا جیسے ہر طرف میلہ سا ہے لگا ہوا

شہرِ نبیؐ کی رونقیں، کوئے نبیؐ کی رحمتیں
اُس سے ہی آ کے پوچھیے جو ہے وہاں گیا ہوا

ذرہ ہے اُنؐ کے پاؤں کا، کہتے ہیں جس کو ماہتاب
ذرّے نے اُنؐ کے نُور کو چہرے پہ ہے ملا ہوا

دل میں درود ہر گھڑی، لب پہ سلام ہر گھڑی
کیسا میرے نصیب پر لطفِ شہِؐ ہدیٰ ہوا

خیرُالوریٰ کو یاد کر، خلقِ خدا کو شاد کر
جی ہے اگر بجھا ہوا، دل ہے اگر دکھا ہوا

اُس نظرِ جمال سے، گردِ ملال چھٹ گئی
ورنہ وبالِ غم سے تھا چہرہ مرا اَٹا ہوا

شانِ شعور و فکر ہے، نطق و نوا کا فخر ہے
جو بھی مرے حضورؐ سے دہر نے ہے سنا ہوا

بابِ سلام اس طرف، بابِ بقیع اُس طرف
صلِ علیٰ ہے زیرِ لب، سر ہے مرا جھکا ہوا

جمِ غفیرِ عاشقاں اور سنہری جالیاں
فرطِ ادب سے اک گدا کونے میں ہے کھڑا ہوا

کس کا قمر یہ ہے، فکر و نظر چمک اُٹھے
کس کا زباں پہ نام ہے لب سے ہے لب ملا ہوا

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

نکلا ہر درد سے ہر اک غم سے
اسم احمد کے ایک ہی دم سے

خاک پائے حبیب کے صدقے
نعت ہو پائے گی کبھی ہم سے

ایک شہکار کر دیا تخلیق
رب کعبہ نے نسل آدم سے

رش نہیں تھا ہر اک طواف کے بعد
ہم نہاتے تھے آب زم زم سے

لوٹتے وقت گنبد خضری
کیا نظر آئے چشم پر نم سے

لے کے آیا ہوں واں سے جام سفال
لاکھ بہتر ہے ساغر جم سے

ایک پڑیا ہے خاک طیبہ کی
جس کے ذرے ہیں ماہ و انجم سے

تھے فرشتے شریک جنگ بدر
رب نے دی فتح کثر کو کم سے

اپنی بخشش کے بارے بھی اکرم
عرض کرنا رسول اکرم سے

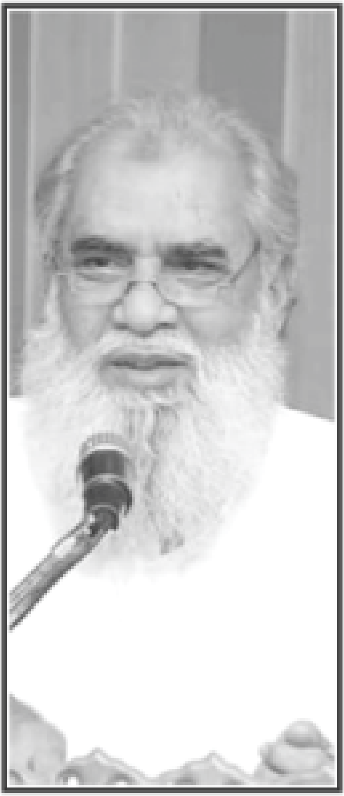

اکرم ناصر

نعتؐ

ان کی گر بات ہی نہیں ہوتی
نعت پھر نعت ہی نہیں ہوتی

جس طرف ہو حضور کا چہرہ
اس طرف رات ہی نہیں ہوتی

آنسوؤں سے نہ ہو وضو جب تک
آپ کی نعت ہی نہیں ہوتی

کملی والے کے عشق سے بڑھ کر
کوئی سوغات ہی نہیں ہوتی

ان کی نظروں سے جو بھی گر جائے
اس کی اوقات ہی نہیں ہوتی

اشک کہتے ہیں دل کا حال وہاں
منہ سے کچھ بات ہی نہیں ہوتی

آقا ہو جائیں جس کے ساتھ جلیل
اس کی پھر مات ہی نہیں ہوتی

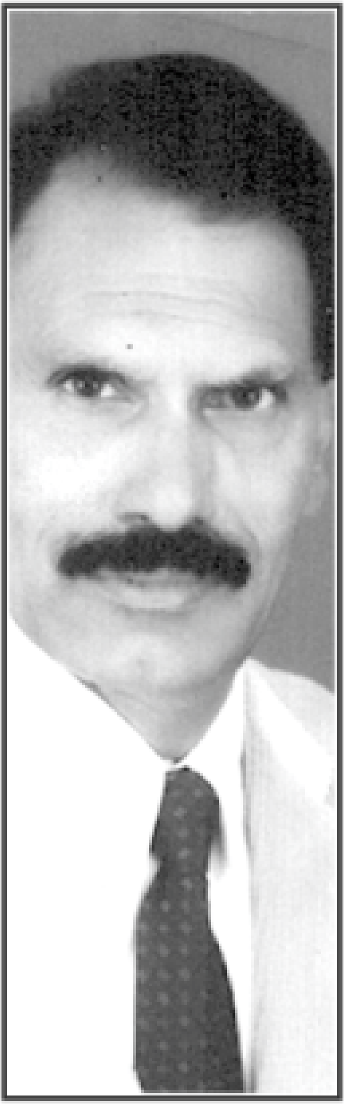

احمد جلیل

نعتؐ

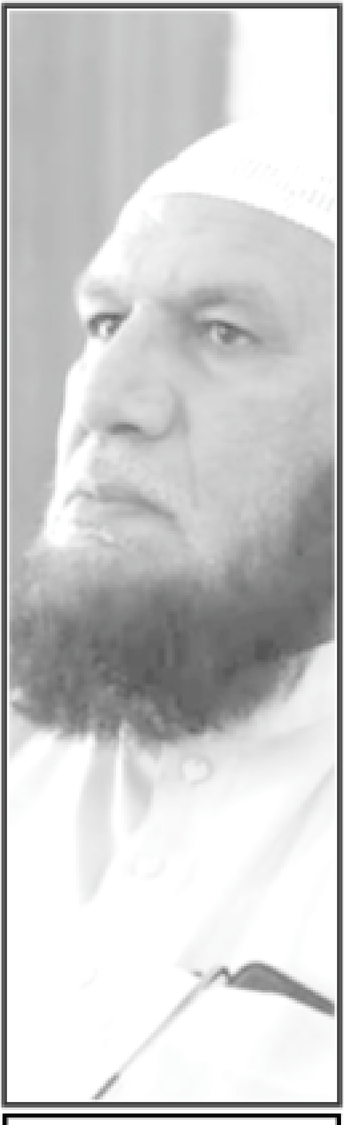

رضا اللہ حیدر

دمِ وداع جو زائر پلٹ کے دیکھتے تھے
بکھر رہے تھے مگر ہر سمت کے دیکھتے تھے

نبی کے روضے پہ وہ چاند جھلملاتا ہوا
ہم اشتیاق سے کچھ دور ہٹ کے دیکھتے تھے

تھے خوش نصیب کہ انوارِ حُسنِ وحدت کو
جو کفر و شرک سے بالکل ہی کٹ کے دیکھتے تھے

شرف عظیم ملا تھا ہمارے اشکوں کو
ہوائے طیبہ کے جھونکے لپٹ کے دیکھتے تھے

طریقِ ہجرتِ نبوی کے کچھ مسافر تو
غبارِ راہ میں دانستہ اَٹ کے دیکھتے تھے

رضا دیارِ نبی کے سفر میں ساتھ اپنے
ہمارے نقشِ کفِ پا گھسٹ کے دیکھتے تھے

نعتؐ

یوں پھوٹتی ہے نطق سے مدحت رسولؐ کی
"ہر لفظ میں ملے گی صداقت رسولؐ کی"

ہر ذرّہ کائنات کا محوِ درود ہے
ہر لحظہ بڑھ رہی ہے سو عظمت رسولؐ کی

آتا تھا جو بھی در پہ خذف کی مثال تھا
ہیرے تراش دیتی تھی صحبت رسولؐ کی

صدیقؓ اور حیدرِ کرّارؓ ہیں بہم
پیغام دے رہی ہے یہ ہجرت رسولؐ کی

حسّان کی سخن وری کیوں معتبر نہ ہو
لاریب اک سند ہے سماعت رسولؐ کی

انسانیت کے آخری ہادی حضورؐ ہیں
تا روزِ آخرت ہے قیادت رسولؐ کی

ایمان تیری رحمت و رافت پہ ہے مگر
مولا! ہمیں عطا ہو شفاعت رسولؐ کی

نذر عابد

نعتؐ

نعت جب روح کے آنگن میں اتر جاتی ہے
کوئی خوشبو ہے جو ہر سمت بکھر جاتی ہے

سیرت سرور عالم کا خیال آتے ہی
مری سوچوں کی فضا اور نکھر جاتی ہے

رنگ و نکہت میں بسی خوشبو بتاتی ہے ہمیں
یہ تو اس در کی طرف راہگزر جاتی ہے

جب بھی ہوتی ہے عطا نعتِ پیمبر مجھ کو
سخن آثار فضا اور سنور جاتی ہے

گو مری آنکھ سے گزرے ہیں نظارے سارے
سوچ پھر بھی اسی منظر کی طرف جاتی ہے

چشمِ نمناک کی ، ہر زخم رسیدہ دل کی
مرا ایمان ہے آقا کو خبر جاتی ہے

اُس طرف کرتا ہے رُخ لطفِ خداوند رضا
جس طرف رحمتِ عالم کی نظر جاتی ہے

علی رضا

نعتؐ

غازۂ کون و مکاں پر حسن کا جوہر کھلا
جب مدینے کی زمیں پر صبح کا منظر کھلا

مدحت سرکار کی ضو باریاں تھیں دیدنی
حشر میں جس دم مرے اعمال کا دفتر کھلا

ان کو خود ہے یا خدا کو ان کے رتبے کی خبر
کب کسی پر آج تک وہ نور کا پیکر کھلا

ان کے ذکر پاک سے ہی وا ہوا باب کرم
مدحت سرکار سے ہی رحمتوں کا در کھلا

اسوۂ سرکار سے یوں جاں معطر ہوگئی
خوشبوؤں کا ہر دریچہ روح کے اندر کھلا

مشکبو ذکر نبی سے ہوگئی یوں ساری فضا
عود جیسے رکھ دیا ہو طشت میں لا کر کھلا

چلتے چلتے اس پہ ہر اک تشنگی بجھتی گئی
زندگی کا ہر معمہ جادۂ شہ پر کھلا

رہنمائی کی مری یوں سیرت سرکار نے
فکر کا اک ایک روزن ذہن کا ہر در کھلا

ان کو دنیا میں کسی شے کی کمی آتی نہیں
نام پر انکے لٹاتے ہیں جو مال و زر کھلا

ایک اک پیاسے کو وہ سیراب کرتے جائیں گے
تشنگی شرمائے گی جب چشمۂ کوثر کھلا

روتے روتے جب مواجہ پر قرار آنے لگا
عقدۂ جاؤک مجھ پر اس گھڑی سرور کھلا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

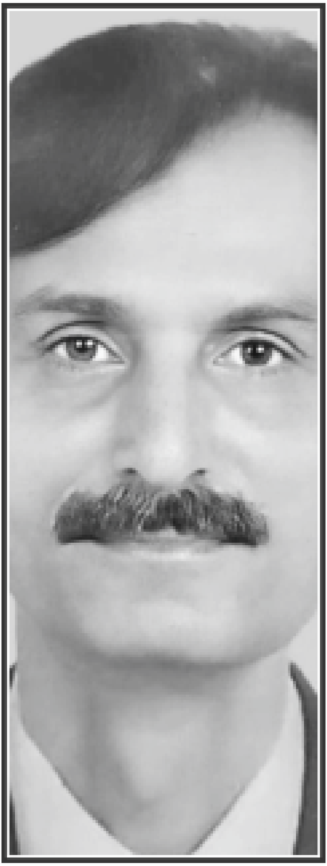

مدحِ محبوبِ کردگار کے ساتھ
کٹ رہی ہے بڑے قرار کے ساتھ

ہو کرم کا معاملہ آقا!
حشر میں معصیت شعار کے ساتھ

دل دھڑکتا ہے ان کی چاہت میں
سانس لیتا ہوں میں وقار کے ساتھ

جاں نثار اُس پہ، زیر کر ڈالا
اپنے دشمن کو جس نے پیار کے ساتھ

لپٹا رہتا ہے دل ہمیشہ ہی
شہرِ طیبہ کی رہگزار کے ساتھ

قریۂ شاہ دوسرا ہے امام
میں ہوں وابستہ جس دیار کے ساتھ

مظہر امام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار

نعتؐ

تصوّر اقبال

کرم سے اس طرح ہر وقت جھولی یہ بھری دیکھی
زمینِ مدحتِ سرکارِ دو عالم ہری دیکھی

ثنائے مصطفیٰؐ کو جب شعار اپنا بنایا ہے
جو قسمت پہلے کھوٹی تھی وہی میں نے کھری دیکھی

خدا نے جن کی خاطر دو جہاں پیدا کیے آخر
بچھونا اُنؐ کا ہم نے کھردری سی اک دری دیکھی

غُلامِ سیدِ ابرار کو طاقت خُدا نے دی
جو بیڑی ڈوبنے والی تھی، پانی پر تری دیکھی

ولادت باسعادت سے ہُوا سارا جہاں روشن
یہ شاخِ مذہبِ اسلام دُنیا نے ہری دیکھی

عَلَم تھاما ہے جب سے مدحِ محبوبِ دو عالم کا
غزل لکھنے کی خواہش اپنے دل میں ہی مری دیکھی

نعتؐ

یوں مصطفیٰؐ کے نور سے پائی ہے روشنی
پڑھ کر درود ہم نے کمائی ہے روشنی

نورِ خدا کا جُزو ہے پیارے نبیؐ کا نور
جلووں میں مصطفیٰؐ کے خدائی ہے روشنی

روشن جو آسماں پہ ہیں سورج، ستارے، چاند
اِن سب نے رُخ سے آپؐ کے پائی ہے روشنی

چھائی ہوئی تھی تیرگی تارِ الست کی
رب نے ترے سبب ہی بنائی ہے روشنی

نعتِ نبیؐ کی شکل میں پھیلی ہے سربسر
قرآن نے جو ہم کو دکھائی ہے روشنی

غارِ حرا میں اُتری تھی قلبِ رسولؐ پر
تاحشر جو زمانوں پہ چھائی ہے روشنی

خوشبوئے مصطفیٰؐ سے معطر ہیں دو جہاں
ہر لمحہ یوں فضا میں سمائی ہے روشنی

تھی تیرگی میں ڈوبی ہوئی ورنہ کائنات
''آئے جہاں میں آپؐ تو آئی ہے روشنی''

اشرف درودِ پاک کی برکات کے طفیل
میں نے دلِ حزیں میں بسائی ہے روشنی

اشرف نقوی

نعت ﷺ

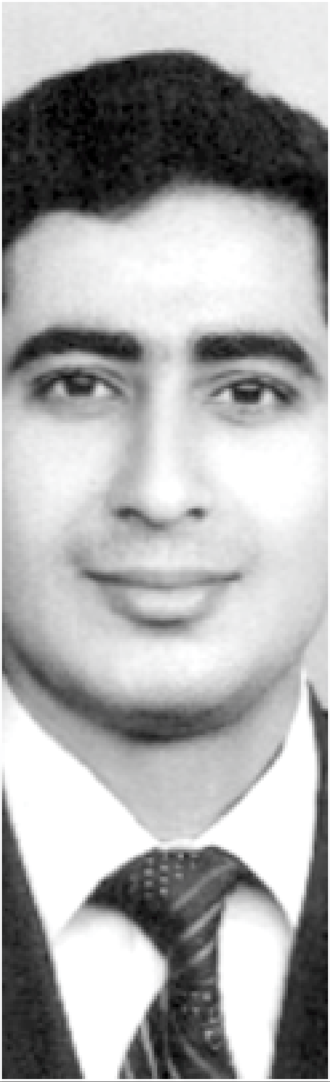

نہ پوچھ کیا ہے جمالِ محمدؐ عربی
نہیں ہے کوئی مثالِ محمدؐ عربی

عرب کے دشت کو گلزار میں بدل ڈالا
ہے ایک یہ بھی کمالِ محمدؐ عربی

مرے خیال سے بڑھ کر کوئی خیال نہیں
ملا ہے جب سے خیالِ محمدؐ عربی

بنیں گے میرا وسیلہ مجھے سنبھالیں گے
بروزِ حشر وہ آلِ محمدؐ عربی

غلامِ حضرتِ عمار اِس لیے ہوں میں
ملا تھا اُنؓ کو وصالِ محمدؐ عربی

خدا نے جن کا بنایا نہیں ہے ثانی کوئی
وہ نقش ہیں خد و خالِ محمدؐ عربی

نبیل اِس لیے خوش بخت ہوں میں دُنیا میں
ہے میری جان نوالِ محمدؐ عربی

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

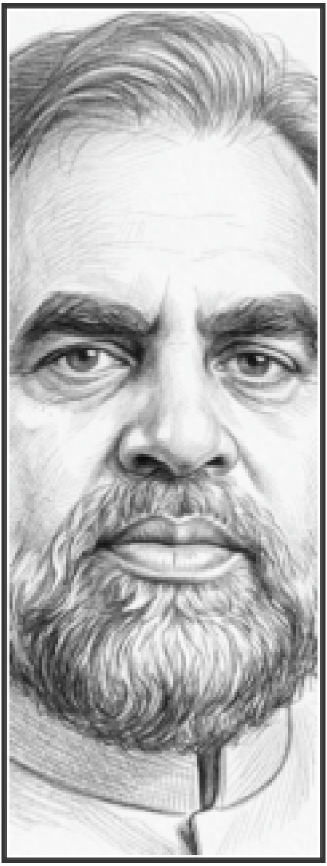

تو ہے سراپا نور تری ہر ادا ہے نور
ذروں میں، مہر و ماہ میں بکھرا ہوا ہے نور

تو وہ ہے ماہتاب کہ جس کو نہیں زوال
تصویرِ کائنات میں تیرا بھرا ہے نور

قصرِ جہاں سے سایۂ ظلمات اٹھ گیا
دینِ ہدیٰ کے روپ میں ہم کو ملا ہے نور

محفل میں ذکرِ صلی علیٰ کے جلے چراغ
دیکھو کہ دشتِ جاں میں بھی پھیلا ہوا ہے نور

اک اک ادا حضور کی پارس ہے اور سحاب
سیرت میں مستقیم کا رکھا ہوا ہے نور

اسلم سحاب ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصدِ مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

سوز و سلام

عرش پر نوحہ و ماتم کا سماں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

راہِ منزل میں ہے وہ پیکرِ قرآں تھک کر
گر نہ جائے کہیں اب قبلۂ ایماں تھک کر
خون روتی ہے جرس، بَین کرے ہے رستہ
تپتی ریتوں پہ ہیں بیمار کے پاؤں خستہ
گردنِ شاہ میں زنجیرِ گراں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

ایک بیمار ہے اور لاکھ ستم کے پہرے
اشک آنکھوں میں ہیں اب خون کے گہرے گہرے
آبلے پاؤں میں ہیں، دھوپ ہے، لمبا ہے سفر
سر جھکائے ہوئے چلتے ہیں وہ ٹھہرے ٹھہرے
طوقِ آہن میں وہ تصویرِ اماں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

شام کا شہر ہے اور بے کسی کا یہ عالم
شورِ ظالم ہے ہر اک سمت، بپا ہے ماتم
خون روتی ہے فضا، خاک اڑی جاتی ہے
کارواں لٹ گیا اور گرد اڑی جاتی ہے
لب پہ سجادؑ کے بس آہ و فغاں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو
شاہِ کربل کو جو دیکھے تو جگر جلتا ہے
جب بھی بیمارؑ کے پیروں سے لہو چلتا ہے
ہو گیا شام کے زنداں میں اندھیرا ہر سو
خون روتا ہے اسیری میں وہ بے کس گیسو
اب اسی حال میں یہ سوز نہاں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

خاکِ یثرب پہ کوئی نوحہ کناں رہتی ہے
بیٹھ کر راہ پہ اکبر کے نشاں تکتی ہے
خط نہیں آتا تو بیمار بہن روتی ہے
بھائی کے غم میں وہ بستر پہ کہاں سوتی ہے

عون الحسن غازی

اب اسی درد کو صغریٰ کی زباں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

بکھرا مقتل کا وہ منظر ہے نگاہوں میں ابھی
ایک ماتم ہے جو برپا ہے فضاؤں میں ابھی
طوقِ عابدؑ ہے، کڑی دھوپ ہے، آہوں کا سفر
ہائے زینبؑ کا وہ سر ننگے وفاؤں کا سفر
اپنی آنکھوں سے بھی اشکوں کو رواں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

خون روتا ہے فلک، مہر کا تیور دیکھو
ایک تصویرِ الم غیب کے اندر دیکھو
بحرِ تسلیم میں ڈوبا ہوا سجدہ ہی سہی
تیرہ و تار ہے افلاک کا منظر دیکھو
چشمِ عابدؑ میں پسِ گردِ رواں رہنے دو
خونِ غم سے لکھا مقتل کا نشاں رہنے دو

عقیدت

آنکھوں کے راستے سے گزرتی ہے نم ہوا
جانے کہاں سے اتنا اٹھا لائی غم ہوا

پہلے سمندروں سے وضو کر کے آئے گی
پھر خاکِ کربلا پہ رکھے گی قدم ہوا

ماتم کناں ہجوم کی آہوں میں ڈھل گئی
کربل میں تھی جو شاہدِ جور و ستم ہوا

صحرا کو لہر لہر میں ڈھالے گی اور پھر
روتی ہوئی ملے گی خدا کی قسم ہوا

کھلتی ہے چشمِ تر پہ فقط شانِ کربلا
کرتی ہے سرخ آنکھ پہ سب کچھ رقم ہوا

صدیاں گزر گئی ہیں وہ مرجھا نہیں رہے
زخموں کو پھول کرتی رہی دم بہ دم ہوا

کترا کے جا رہی ہے مدینے سے شرمسار
کربل سے چل رہی ہے جو سوئے حرم ہوا

چشمِ فلک میں ایسا علم دار اب کہاں
لہرا رہی ہے آج بھی جس کا علم ہوا

پانی نہ تھا تو سانس بہم کر رہی تھی وہ
اس دن سے ہو گئی ہے کنور محترم ہوا

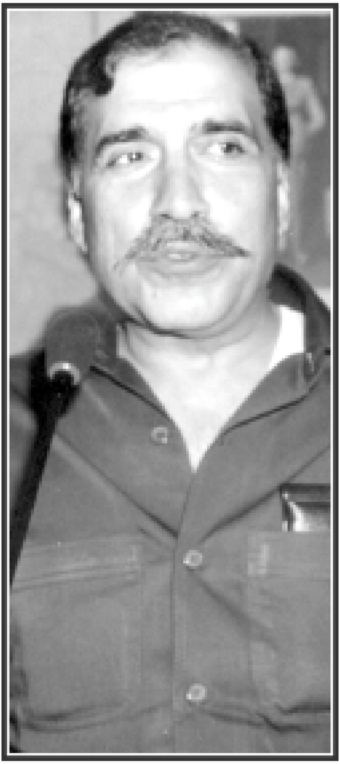

اعجاز کنور راجہ

عقیدت

کوثرِ فکر و نظر ہے سیرتِ صدر العلیٰ
منبع علم و عمل ہے سنتِ کہف الوریٰ

ترینا والبعث سے ہے "کوئے سعادت کی نموؔ"
"سیدُ السادات" سے ہے عظمتِ اُمّ القریٰ

اسمِ احمد میں یہ بھی طے ہے آگے حشر تک
اُسوۂ ختم الرسل ہے زینتِ اہلِ التقیٰ

ہیں محمد ہی وہ شمعِ محفلِ ربّ الست
جس کی ضو سے ہے منور فطرتِ قالوا بلیٰ

دل اگر سچا ثنا خواں ہے تو ہو پھر حرزِ جاں
الفتِ اسمِ محمد ، نسبتِ المصطفیٰ

"شاخِ قرطاس و قلم" پر علم و دانش کے ثمر
ہر ورق فیاضِ نورِ رحمتِ صلِّ علیٰ

نعت وہ لکھو کہ آصف ! جان و دل علم و عمل
سب سجا لیں بزمِ نازِ سیرتِ شمس الضحیٰ

مرزا آصف رسول

ہائیکو

سبز رُت کا ابھی اشارہ دیکھ
یہ خزاں کے مِلن کا وقت نہیں
پھر بھی قدموں میں دل ہمارا دیکھ

اُس کے پیکر سے بجلیاں پھوٹیں
خوشبوئیں اُس کے اِردگرد ہیں سب
تتلیاں لمس کے مزے لوٹیں

جو بھی سُنتا ہے روبرو سُن لے
لب کسی کے اگر ہیں چُپ چُپ سے
ہر اشارے میں گفتگو سُن لے

سُرخ آنچل پہ وار دیں کلیاں
پُھول گیندے کا اُس کو پیش کیا
سامنے اب اُسی کی ہیں گلیاں

نیند میں پھول ہیں، ستارے ہیں
ہر طرف ہے مِلن کی خوش خبری
سب یہ کہتے ہیں وہ، ہمارے ہیں

اُس کی آنکھوں میں خواب جاگے ہیں
ہائیکو میرے پڑھ رہی ہے وُہ
پھر چمن میں گلاب جاگے ہیں

بیٹھ کر سائے میں درختوں کے
ہم محبت کا پُھل تلاش کریں
زائچے دیکھتے ہیں بختوں کے

اُس بدن پر نظر بھٹکتی ہے
چھوٹ جائے نہ ہوش کا دامن
آنکھ اُس پر ہی بس اٹکتی ہے

کب تھی جرأت بھلا کمانوں میں
تیر پھینکے گئے ہیں نظروں کے
چور داخل ہوئے مکانوں میں

رنگ بکھرائے جامنی آنچل
سنگِ سرمد کی وہ لگے مورت
جب ہٹاتی ہے کامنی، آنچل

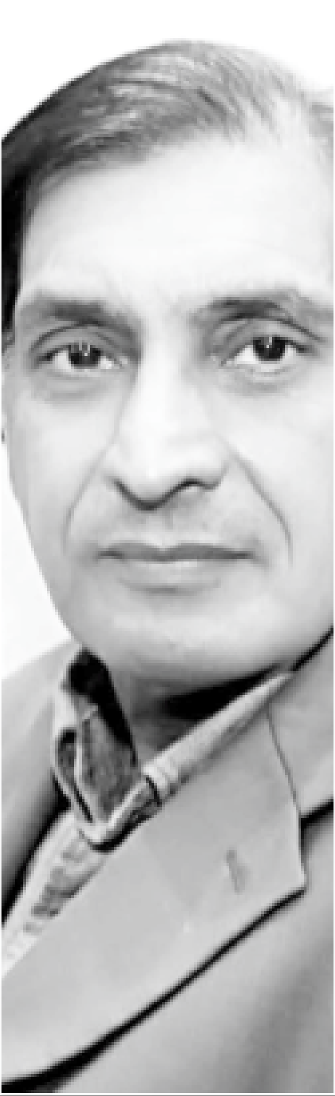

آفتاب خان

تیرتے ہیں گلاب پانی میں
عشق میں ڈوب جائیں ہم دونوں
کیا ہے رکھا سرائے فانی میں

محوِ پرواز چند پریشاں ہیں
اک گلستان میں پڑاؤ ہے
اور مجھ کو پسند پریشاں ہیں

چند کالے گلاب چُنتے ہیں
اور پھر ریشمی دوپٹے کے
اپنی آنکھوں میں خواب بُنتے ہیں

عشق کی ایک گھات کا منظر
پھر نہ اوجھل کبھی ہُوا دل سے
رُک گیا سرد رات کا منظر

مِل رہا ہے سرور آنکھوں کو
بند ہونٹوں کا یہ تقاضا ہے
کاش چومیں ضرور آنکھوں کو

ستمبر 1965 تاریخ ساز گھڑی

عجب گھڑی تھی
شب گریزاں کی کالی رت میں
اک آفت ناگہاں کھڑی تھی
وہ ساعت خونچکاں
اچانک سروں پہ اپنے گری پڑی تھی
غنیم۔ تاریکیوں سے مل کر
خبیث آلائشوں سے لتھڑی
شرارتوں پہ تلا کھڑا تھا
شرافتوں کا گلا دبانے
ہمارے ملی وجود کو وہ عدم کا رستہ دکھانے آیا
ہمارے قومی وقار کو وہ مٹانے آیا
وہ سوئے لاہور چل پڑا تھا
کہ اس کو زیر نگیں وہ کر لے
وہ شر کا جھنڈا بلند کر لے
عجیب چالوں میں گم ہوا تھا
وہ گم ہوا تھا

ہماری جانوں کو آ گیا تھا
وہ اپنی غیرت کو کھا گیا تھا
ہماری غیرت جگا گیا تھا
ہماری بیدار آنکھ
اس کے تمام حیلوں کو جانتی تھی
ہمیں پتہ تھا
ہمارا دشمن نہایت اسفل، نہایت ارذل
معاملات جہاں میں بدتر
وہ حشر ساماں حماقتوں سے
وہ بدقماشی سے، بدلحاظی سے
اپنے ہاتھوں سے خود مرے گا
ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں
خباثتوں کی تماشا گر تھیں
حرارتوں سے ضمیر شعلہ فشاں ہوئے تھے
خیالی آتش فشاں ہوئے تھے
ضمیر کی ان حرارتوں سے

سید ریاض حسین زیدی

امید افزا تمازتوں سے
وہ ساعت خونچکاں
عزیز ایماں بنی تھی
کمال حفظ و اماں ہوئی تھی
ہماری خاطر سروں پہ اپنے
ردائے رحمت بھی تو تنی تھی
دلوں میں اپنے یہی ٹھنی تھی
کمین دشمن نہ جانے پائے
وہ منہ کی کھائے
رذیل چہرہ نہ پھر دکھائے
شکستہ پا ہو کے لوٹ جائے
خدائے حفظ و اماں نے اپنے خصوصی
فضل و کرم سے بڑھ کر
ہماری خواہش کی لاج رکھ لی
کمینِ دشمن نے موت چکھ لی

☆☆☆☆☆

چھ ستمبر 1965 فتح و نصرت کا نشاں

چھ ستمبر فتح و نصرت کا نشاں چھ ستمبر پرچمِ مہر و وفا
چھ ستمبر زندگی کا ترجماں چھ ستمبر سرزمینِ ارتقا

چھ ستمبر جرأتوں کا امتحاں چھ ستمبر منجمد دریا میں موج
چھ ستمبر کامیاب و کامراں چھ ستمبر ولولہ آمیز فوج

چھ ستمبر لالہ زارِ دوستاں چھ ستمبر حُسنِ میدانِ وغا
چھ ستمبر خارزارِ دشمناں چھ ستمبر عشقِ تجدیدِ وفا

چھ ستمبر ناشرِ پیغامِ دیں چھ ستمبر یادگارِ الجہاد
چھ ستمبر قاسمِ نورِ یقیں چھ ستمبر زندہ باد و زندہ باد

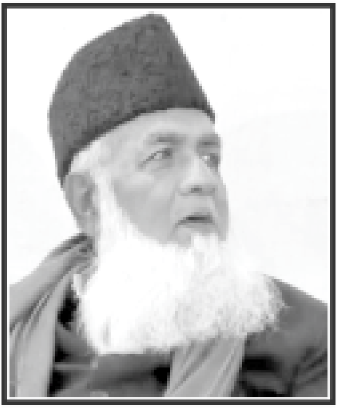

چھ ستمبر نعرۂ حق کا فروغ
چھ ستمبر ناسخِ فسق و دروغ

چھ ستمبر زندگانی کی دلیل
چھ ستمبر عزم و ہمت کی فصیل

چھ ستمبر یادِ ابنائے وطن
چھ ستمبر غازیوں کی انجمن

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

وطن سے وفائیں کرنے کا جواز

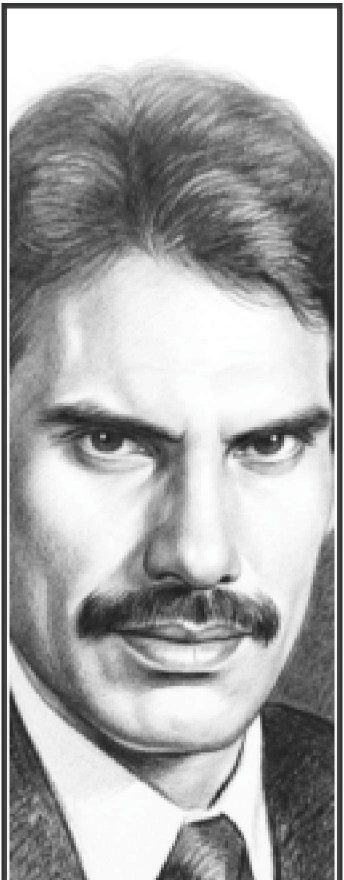

میں کیا بتاؤں تمہیں کس طرح بنایا ہے
کٹا کے فصل سروں کی یہ دیس پایا ہے

اندھیری رات کے لمبے سفر کے بعد کہیں
سحر کے ماتھے پہ یہ نور جگمگایا ہے

ستم خزاؤں کے جھیلے ہیں ہم نے قرنوں تک
تو پھر بہار کا منظر یہ مسکرایا ہے

اسی نے دھوپ رتوں میں ہیں خنکیاں بخشیں
اسی شجر کا سروں پر ہمارے سایا ہے

زمین کا ٹکڑا نہیں ہے یہ ارض پاک فقط
یہ جسم و جان کے رشتے کا اک کنایہ ہے

اسی لئے مری ساری وفائیں اس کے لئے
دل و نظر میں اسے اس لئے بسایا ہے

اسی کے نام سے ہے نام معتبر میرا
یہی حوالہ میری زندگی کی مایا ہے

احمد جلیل

نذرِ وطن

مرے وطن، مری جنت، دل ونظر کے قرار
تو میرا دل، مری جاں میرا جانِ جاں، مرا پیار
ہزار بار اگر زندگی ملے مجھ کو
میں تیرے نام کی حرمت پہ بار بار نثار

مرے عزیز وطن، میرے پیارے پاکستان
تو میری عزت وناموس، میری سطوت وشان
ترے بغیر مری زندگی ہے بے معنی
ترے وجود سے ہے میری ذات کی پہچان

دھڑکتے دل ہیں ترے پتھروں کے سینوں میں
متاعِ مہر و وفا ہے ترے خزینوں میں
قدم قدم پہ یہاں برقِ طور دیکھی ہے
چھپے ہوئے یدِ بیضا ہیں آستینوں میں

محبتوں کے خزانے ہیں کوہساروں میں
بھڑکتے پیار کے شعلے ہیں لالہ زاروں میں
بصد خلوص نظر سجدہ ریز ہوتی ہے
نہاں وہ حسنِ ازل ہے ترے نظاروں میں

مرا وطن مرے اجداد کی امانت ہے
خدائے پاک کا انعام ہے، عنایت ہے
رہین منت اسلام ہے وجود اسکا
مرے وطن کی حفاظت مری عبادت ہے

مرتضیٰ سیّد

رباعیات

دریا دریا موجۂ ساغر میرا
قطرہ قطرہ عرصۂ مظہر میرا
میں نورِ سبو سورج میری کرن
ذرہ ذرہ دیدۂ منظر میرا

مغرور ہوا ایک دیا چاہتی ہے
سو آنکھ دریچوں کی کھلا چاہتی ہے
بیٹھی ہے بدن اوڑھے ہوئے عریانی
پازیب چھنکنے کی صدا چاہتی ہے

الفاظ کے بم گراتا ہوں کاغذ پر
میں خواب نئے جگاتا ہوں کاغذ پر
کرتے ہیں وہی اٹھ کے بغاوت مجھ سے
میں آدمی جو بناتا ہوں کاغذ پر

خورشید کو باندھو نہ رسن کی زنجیر
پہناؤ مجھے اڑتی کرن کی زنجیر
میں کیسے کروں عشق سے آگے کا سفر
کھولو مرے پاؤں سے وطن کی زنجیر

یہ آنکھ فروغِ بادہ سے بینا ہے
خورشید چراغِ شعلۂ مینا ہے
اک صورت ہے صورتِ عالم پہ محیط
دل ہے کہ رخِ سبو کا آئینہ ہے

رنگ اس کے آنچل سے پھسل جاتے ہیں
رستے قوسِ قزح میں ڈھل جاتے ہیں
وہ ریشمی زلفیں کہیں لہرائیں تو
تصویر کے پیرہن بدل جاتے ہیں

قطرہ قطرہ اچھل رہے ہیں سر میں
غم کی شادی ہے آنسوؤں کے گھر میں
اللہ رے شادمانیٔ غم کی برات
آنسو ہیں کہ ناچتے ہیں چشمِ تر میں

آزادی کی بھوک میں علم رکھ آیا
نادار خلافت کا حشم رکھ آیا
میں خواب فروشوں کے قبیلے کا فرد
بازار میں تیشۂ قلم رکھ آیا

محمد نصیر زندہ

رباعیات

آ عشق پہاڑی پہ چلیں پیدل ہی
فطرت کے مظاہر سے ملیں پیدل ہی
ہر رستے، پہ ہر موڑ پہ اک حیرت ہے
انجانے کچھ اسباق پڑھیں پیدل ہی

تیری میری کوئی الگ بات نہیں
دکھ کی ڈھیری کوئی الگ بات نہیں
حاضر میری جان، ہے تجھ پر قربان
مشکل تیری کوئی الگ بات نہیں

ابتک زندہ ہوں میں بے دھیانی میں
سانسیں لیتا ہوں میں بے دھیانی میں
اس کو دیکھوں تو بے مقصد اس کے
پیچھے چلتا ہوں میں بے دھیانی میں

جاتے ہوئے لمحوں کا طرف دار نہیں
بجھی ہوئی آنکھوں کا طرف دار نہیں
اک دوست تھا میرا وہ بھلے وقتوں میں
اب پچھلے زمانوں کا طرف دار نہیں

جیسے بھی ہیں یاروں کے طرف دار ہیں ہم
اب وقت کے دھاروں کے طرف دار ہیں ہم
گو صبح کا تارا ہمیں بھاتا ہے بہت
پر شام کے تاروں کے طرف دار ہیں ہم

ان ادھ کھلی آنکھوں کا پرستار ہوں میں
رنگے ہوئے خوابوں کا پرستار ہوں میں
دکھ ان کے سمجھ سکتا ہوں میں پوری طرح
بے موت کے ماروں کا پرستار ہوں میں

اب کھل کے خیالات کا اظہار کریں
بگڑے ہوئے حالات کا اظہار کریں
کب تک رہیں ہم مردہ زبانوں کے ساتھ
بھرپور سوالات کا اظہار کریں

کمرے میں اُجالا ہوا جب وہ آیا
یہ کام نرالا ہوا جب وہ آیا
کوئی بھی شکایت نہ رہی پھر خود سے
ہر دکھ کا ازالہ ہوا جب وہ آیا

سعید اشعر

قطعات

خاور اعجاز

وقت کی کوئی بات نہ کر
وقت بدل بھی جاتا ہے
سورج چڑھتا ہے لیکن
سورج ڈھل بھی جاتا ہے

جب بھی میرے نجوم حرف کبھی
آسمانوں پہ جا نکلتے ہیں
کرۂ ارض کے مکیں اُن کو
چاند کی شاعری سمجھتے ہیں

میرا احساس گر نہیں تھا تجھے
دل کا احساس ہی کیا ہوتا
بے رُخی سے پکارنے والے
مجھ سے احساس لے لیا ہوتا

شبنمیں رُت ہے اور آنکھوں میں
جلتے بجھتے چراغ روشن ہیں
گویا اِک چاند جیسے چہرے پر
کچھ ستاروں کے داغ روشن ہیں

دو پاٹن کے بیچ

ایک پرندے کی آنکھ سے اس گنجان آباد شہر کو دیکھیں تو یہ ایک نقشہ نہیں سانس لیتا ہوا وجود لگتا ہے، جس کے اندر بے شمار زندگیاں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ دریا اس کے گرد نہیں بہتے، اس کے اندر سے گزرتے ہیں، یوں جیسے یادیں جو کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتیں بہتی ہوئی ہر شے میں سرایت کر جاتی ہیں۔ یہ شہر ایک ساتھ کئی زمانوں میں بٹا ہوا ہے۔ کہیں شیشے کی عمارتوں پر سورج ٹھہرتا ہے، جیسے حال کی جدت نے خود کو نمایاں کر رکھا ہو۔ کہیں پرانی چھتوں پر وقت دھیرے دھیرے لہراتا ہے، ایسے بوسیدہ کپڑوں کی طرح جو پوری طرح سوکھتے نہیں اور ہوا کے جھونکوں میں چیتھڑوں کی طرح جھولتے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر گاڑیاں ایک مستقل شور مچاتی بھاگ رہی ہیں اور رکشے رنگوں کی طرح، سرخ، سبز، پیلے، جیسے شہر اپنی تھکن کو خود ہی دیکھنے کے قابل بنا رہا ہو۔ نظر جب پھسلتے ہوئے نیچے اترتی ہے تو شہر بدلنے لگتا ہے۔ سڑکیں سکڑتی ہیں، راستے پیچ دار ہو جاتے ہیں، اور پھر ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں نقشہ اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ترتیب بکھر جاتی ہے، فاصلے ختم ہو جاتے ہیں، جگہیں محض ہجوم میں بدل جاتی ہیں اور شہر اپنے آپ میں سمٹنے لگتا ہے۔

بوڑھی گنگا کے کنارے کی وسعتوں میں سمٹے ڈھاکہ میں محمد پور جنیوا کیمپ ہے۔ اوپر سے دیکھیں تو یہ محض چھتوں کا جھنڈ ہے، ٹین، اینٹ اور پرانے کپڑوں سے ڈھکا ہوا، جیسے کسی نے پھٹی پرانی یادوں کو عجلت میں بٹور کر یہاں ڈھیر کر دیا ہو۔ نیچے، انھی چھتوں کے نیچے کھلے کے ڈربوں میں وقت کا اسراع بدل جاتا ہے۔ یہاں دن گزرنے کے بجائے ٹھہر جاتے ہیں، اور راتیں ختم ہونے کے بجائے پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ آسمان ایک سوال کی طرح دکھائی دیتا

محمد حمید شاہد

ہے۔ ادھورا اور کٹا ہوا۔ روشنی اندر آتے آتے اپنی شدت کھو دیتی ہے، اور آوازیں ایک دوسرے میں یوں الجھ جاتی ہیں جیسے اپنی پہچان ڈھونڈ رہی ہوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں جگہ خود ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور وقت، ایک انتظار۔ اسی انتظار کے بیچ، انہی گلیوں میں، صغریٰ بی بی کی صبح ہوتی ہے۔ ذرا دیر سے، جیسے روشنی کو بھی اندر آنے سے پہلے یہ یقین کرنا پڑتا ہو کہ یہاں اب بھی کوئی زندہ ہے۔

ہوا میں نمی نہیں، ایک باسی پن ہے۔ پسینے، دھوئیں اور پرانی یادوں کا ایسا مرکب جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ صغریٰ بی بی کی آنکھ کھلتی تو سب سے پہلے چھت کو دیکھتی، جو برسات کے بعد کچھ اور نیچی محسوس ہونے لگتی یا شاید وہ خود اپنے اندر ہی اندر جھکنے لگی ہے۔ چولہے کی جگہ اب ایک چھوٹا سا اسٹوو ہے، اور لکڑی کے دھوئیں کی جگہ مٹی کے تیل کی بو نے لے لی ہے۔ تاہم ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا اور گزرے وقت میں پختہ ہو چکی عادتیں کسی ضدی بچے کی طرح جگہ بدلنے سے نہیں بدل رہیں۔ وہ چائے چڑھاتی ہے، پانی کو ابلتے دیکھتی ہے، اور ایک لمحے کو یوں محسوس کرتی ہے جیسے وقت نے پلٹ کر اسے دیکھا ہے اور پھر پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔

خمیدہ کمر اور الجھے سفید بالوں والا محمود علی اب کم بولنے لگا ہے۔ مگر ایک زمانہ تھا جب اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک ہوا کرتی تھی جو اس کی اپنی نہیں تھی وہ اس کے باپ کی آنکھوں سے اسے منتقل ہوئی تھی۔ وہ صرف سات برس کا تھا جب اس کے ماں باپ نے بہار کے مونگیر اور جموئی سے ہجرت کی تھی۔ اس کے باپ کی آواز میں ایک عجیب سا یقین تھا۔ ایسا یقین جس میں وہ گھر اجنبی ہو گیا تھا جس میں وہ رہ رہے تھے۔ آس پاس کے لوگوں سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ کسی نقصان کی طرف نہیں بلکہ کسی خوابوں کی زمین کی طرف جا رہے تھے۔ اس کی ماں نے گھر کے آنگن کی مٹی کو ہاتھ لگا کر آنکھوں سے لگایا تھا، مگر اس کے باپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: ''وہاں ہمارا اپنا ملک ہوگا۔'' سات سالہ محمود علی کی سمجھ میں یہ جملہ نہیں آیا تھا۔ تب وہ وطن کا مطلب بھی ڈھنگ سے نہیں جانتا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کوئی زمین کیسے وطن بنتی ہے اور کیسے پرائی ہو جاتی ہے؟ تاہم اس نے اپنے باپ کی بات اور جذبے کو محسوس کیا تھا۔ یہی احساس اس کے اندر کہیں ٹھہر گیا تھا، ایک ہجرت کی صورت میں جو جستجو اور یقین ہو گئی تھی، سزا نہیں۔ محمود علی کا دو سالہ بھائی یوسف، ماں کی گود میں تھا۔ بے خبر، مگر ماں کی دھڑکنوں کے ساتھ جڑا ہوا۔ اور ماں مڑ مڑ کر اس گھر کو دیکھتی تھی جس کے آنگن میں نیم کا درخت

اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ وہ ایک قافلے کے ساتھ ہو لیے تھے، ہجوم، شور اور انجان راستوں کے بیچ، ننھے محمود علی کے لیے ہجرت ایک مہم تھی، خوف سے زیادہ تجسس اور بچھڑنے سے زیادہ کہیں اور پہنچنے کی للک۔

اب وہی محمود علی ہے جسے بڑھاپے نے زمین کی طرف جھکا دیا ہے۔ یہ وہی زمین تھی جس پر اس کے باپ اور ماں نے بھی سجدے کیے تھے، ان دونوں کی قبریں یہیں بنی تھیں مگر وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ زمین اس سے دور ہو گئی۔ اب وہ اپنی یادوں کو چھوتا تو اسے لگتا ہے جیسے وہ ایک سراب میں وہ تھا اور جو یقین اس کی جھولی میں ڈالا گیا تھا، اس کا اپنا نہیں تھا، ایک ادھار کا خواب تھا، جو وقت کے ساتھ واپس لے لیا گیا۔

اب اس کے پاس الفاظ تھے، مگر جیسے وہ اپنے مفہوم سے خالی ہو گئے تھے۔

کبھی کبھی وہ اخبار کے ایک پرانے ٹکڑے کو بار بار پڑھتا، جیسے اس میں کوئی ایسا جملہ ڈھونڈ رہا ہو جو اس کے وجود پر تنی ہوئی تلخ حقیقت کو جھٹلا دے۔ ایک زمانے میں وہ کہا کرتا تھا کہ 'یہ عارضی ہے---' اب وہ ایسا نہیں سمجھتا تاہم اس کی خاموشی کے پیچھے کہیں یہی الفاظ ایک تھکے ہوئے سائے کی طرح لرزتے رہتے ہیں۔

کیمپ کی گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ دو آدمی ساتھ چلیں تو ایک کو سانس روکنی پڑتی۔ دیواروں کے اس پار بھی زندگیاں تھیں، اتنی قریب کہ کسی کے کھانسنے کی آواز دوسرے کے خواب میں داخل ہو جاتی۔ دن اور رات یہاں الگ الگ وقت نہیں تھے، صرف تھکن باری باری آتی اور بدلتی ہوئی صورت میں آتی تھی۔ کچھ لوگ دن میں سوتے، کچھ رات میں، جیسے زندگی نے خود کو برابر حصوں میں بانٹ کر ہار مان لی تھی۔

نسرین جب گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کے نل سے پانی بھرتی عورتوں کی باتیں سنتی تو اس کے ذہن کے پردے پر طرح طرح کے نقشے بنتے تھے۔ وہ عورتیں باتیں کم، سرگوشیاں زیادہ ہوتیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا ذکر کرتی جو کہیں باہر تھا، کوئی کسی فہرست کا جس میں نام آنے کی امید تھی، کوئی کسی ایسے کاغذ کا جو یہ طے کر سکتا تھا کہ وہ یہاں کی ہے یا وہاں کی۔ مگر ان سرگوشیوں میں ایک چیز مشترک تھی۔ ایک ایسا انتظار جو ختم نہیں ہوتا، صرف انسان کے اندر گہرا ہوتا جاتا ہے۔

نسرین کے لیے یوسف اب ایک یاد بھی نہیں رہا تھا، ایک کیفیت ہو گیا تھا۔ سن اکہتر کے خونی ہنگاموں میں ایک دن اچانک شور اٹھا تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے، دروازے بند ہو رہے تھے، چیخیں فضا میں تیر رہی تھیں۔ اسی افراتفری میں اس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اس کا شوہر یوسف بھی۔ نسرین اپنوں کو بچانے چیختی چلاتی حملہ آوروں پر

جھپٹی تو اسے پیچھے دھکیل دیا گیا- اسے زور کا دھکا لگا تھا- زمین پر گرتے گرتے اس کے اندر سب کچھ ٹوٹ گیا تھا- وہ پانچ ماہ کے حمل سے تھی- اسی رات اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا اور اس کے بعد اس کی دنیا بدل کر ایک سیاہ گاڑھا محلول ہو گئی تھی- وجود کے اندر سے باہر کی سمت بہتا گاڑھا محلول، جیسے وہ ایک کچلے ہوئے اور پیسے ہوئے لوتھڑے کے لہو میں گوندھا گیا گاڑھا محلول تھا- وہ گلیوں میں گھومتی رہتی، کھیلتے بچوں کو دیکھتی، اور اچانک ان کی طرف بڑھتی یہ کہتے ہوئے 'میرا بچہ'- مگر بچے بھاگ جاتے- اس کے خالی ہاتھ ہوا میں تھرتھراتے رہ جاتے- اس کی گود خالی تھی، مگر اس کے بازو اب بھی کسی کو تھامنے کے لیے اٹھتے تھے-

وہ جہاں تھی، ڈھنگ سے سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کہاں تھی- ایک روز صغریٰ بی بی نے اپنی بیوہ بہو کی طرف دیکھا تو اپنے شوہر سے کہا تھا:

''محمود اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ زیادہ ہوتا ہے یا اپنے اس وجود کا جو کسی زمین پر بوجھ بن چکا ہو-''

بوڑھا محمود علی ہر سوال کا جواب نہیں دیتا- اسے ثقلِ سماعت کا عارضہ تھا اور کبھی کبھی وہ سنا ہوا بھی ان سنا کر دیتا تھا- گھر اتنے چھوٹے تھے کہ محلے بھر کے بچے سارا دن گلی میں اودھم مچاتے رہتے تھے- کبھی کبھی نسرین ان بچوں سے بے نیاز ہو کر اندر کمرے میں گھس جاتی اور ایک ٹرنک کھول کر بیٹھ جاتی- وہ یوسف کی قمیض کو کھول کھول کر دیکھتی اور پھر تہہ کر کے رکھ دیتی- کپڑا پرانا ہو چکا تھا، مگر اس میں ایک عجیب سی حرارت جیسے اس کے لیے ابھی تک باقی تھی یا شاید یہ اس کے اپنے ہاتھوں کی گرمی تھی، جسے وہ کھو دینے سے ڈرتی تھی- کبھی کبھی وہ سوچتی اگر کوئی شخص اچانک غائب ہو جائے تو کیا وہ واقعی ختم ہو جاتا ہے؟ یا وہ ان چیزوں میں بکھر جاتا ہے جنھیں ہم چھوڑ نہیں پاتے؟ گلی میں کھیلنے والے بچے بڑے ہو رہے تھے- ان کی زبان میں بنگلہ کے الفاظ بڑھتے اور اردو کے کم ہوتے جا رہے تھے- وہ کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو انہی ناموں سے پکارتے جو کیمپ کے باہر کی دنیا سے آئے تھے- مگر جب کوئی باہر کا بچہ انہیں بلاتا، تو لہجے میں ایک باریک سی دراڑ محسوس ہوتی- ایک ایسی لکیر، جو دکھائی نہیں دیتی، مگر الگ کر دیتی ہے-

''ہم کہاں کے ہیں؟''

ایک دن سامنے والے گھر سے باہر نکلتے ننھے نعیم اپنے باپ سے پوچھا تھا- صغریٰ بی بی جو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی، بچے کا یہ سوال سن کر چونکی اور پوری طرح ادھر متوجہ ہو گئی- اسے یہ بات عجیب لگی تھی کہ وہ سوال جوان کی بوڑھی نسل کا تھا اب تیسری نسل کو بھی منتقل ہو گیا تھا- باپ نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے

کہا، "جہاں تم کھڑے ہو--- فی الحال یہیں کے ہیں۔" وہ ہنس دی، اور بڑبڑائی: "یہ فی الحال شاید ہی کبھی ختم ہو۔"

کیمپ کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی دکان تھی جہاں پرانے ریڈیو سے کبھی کبھار گانے بجتے۔ ان گانوں میں ایک گمشدہ وقت کی خوشبو تھی۔ جا چکا ایسا وقت جو اب صرف آوازوں میں زندہ تھا۔ محمود علی وہاں کھڑے ہو کر سنتا رہتا، آنکھیں بند کیے، جیسے آوازیں اسے واپس لے جا سکتی ہوں، اسی پرانے وقت میں۔ ایک دن ایک نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا،

"چچا، آپ اب بھی وہی پرانے گانے سنتے ہیں؟"

محمود علی نے اسے آنکھ بھر کر دیکھا، مسکرانے کی کوشش کی، مگر مسکراہٹ پوری نہ ہو سکی اور بوجھل آواز میں کہا:

"ہاں وہی سنتا ہوں--- جو بھولتا ہی نہیں ہے۔"

کیمپ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو شناخت ثابت کرنے والے کاغذات کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک چکے تھے۔ اب ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ اس زمین پر زندہ تھے۔ مگر یہاں زندہ ہونا کافی نہیں تھا۔ یہاں ہر چیز کو ثابت کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا وجود بھی۔ ایک بوڑھا، جس کا بیٹا بلوائیوں نے مار ڈالا تھا اور وہ تب سے اپنے حواس میں نہیں تھا مگر اکثر ایک مکمل جملہ بڑبڑایا کرتا تھا:

"ہم درخت ہیں مگر ہماری جڑیں کٹ ہی اور رہ گئی ہیں---"

اس کیمپ کا کوئی بھی شخص اس پر ہنستا نہیں تھا، کیونکہ سب جانتے تھے، یہ تشبیہ نہیں، ایسی حالت تھی جوان کا بخت ہو گئی تھی۔

رات کو جب سب سو جاتے، تو کیمپ ایک عجیب سی خاموشی میں ڈوب جاتا۔ یہ وہ خاموشی نہیں تھی جو سکون کی تھپکی دیتی ہے، بل کہ وہ جو وجود اور بقا کے تلخ سوالوں کو اور بھی تلخ کر دیتی ہے۔ صغریٰ بی بی کبھی کبھی جاگتی اور کچے فرش پر لکیریں کھینچتی رہتی۔ وہ ناخنوں سے مٹی کھرچ کر ڈھیری بناتی اور پھر ہتھیلی پر رکھ کر یوں پھونک دیتی جیسے اس میں سانس بھر رہی ہو۔ وہ آہستگی سے اپنے آپ سے سرگوشی میں پوچھتی:

"انسان اپنی زمین کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لا سکتا ہے؟ --- اور جس زمین سے ہم وفا کا رشتہ باندھتے ہیں وہی کیوں بے وفا ہو جاتی ہے؟"

اسے کوئی جواب نہیں سوجھتا نہ ہی مٹی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ دور کہیں کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے یا کسی بوڑھے کے کھانسنے کی ہلکی سی گونج۔ اور پھر وہی احساس کہ وقت یہاں گزرتا نہیں، ٹھہرا رہتا ہے، اور اس کے اندر لوگ آہستہ آہستہ گھلتے رہتے ہیں، جیسے پانی میں ڈالا گیا نمک گھل رہا ہوا۔ کبھی کبھی

وہاں سے گزرتے والے بنگالی نوجوان، ان ڈربہ نما گھروندوں میں دبکے پڑے بہاریوں پر ایک نظر ڈالتے اور یوں آگے بڑھ جاتے تھے جیسے یہ جگہ اور یہاں کے لوگ کسی اور دنیا کا حصہ ہوں۔

اس دنیا کے اندر، محمود علی، صغریٰ بی بی، نسرین، اور ان جیسے بے شمار لوگ ایک ایسی زندگی جی رہے تھے جو مکمل بھی تھی اور ادھوری بھی۔ ان کے پاس ماضی تھا جو ختم نہیں ہوتا تھا — اور ایک حال بھی جو پوری طرح شروع ہی نہیں ہوتا تھا --- اور مستقبل؟ وہ تو شاید لغت میں پڑا ہوا ایک اجنبی لفظ تھا جو ان کی رسائی میں تھا ہی نہیں۔

وطن کے اس حصے میں جس سے بنگلہ دیش نکلا تھا، سمندر کنارے ایک قدیم شہر تھا۔ بہت بڑا شہر کراچی۔ اسی شہر میں محمود علی کا بیٹا حبیب علی ایک اور طرح کے کیمپ میں تھا۔ کھلے شہر کے اندر ایک بند دائرے میں۔ جب ملک ٹوٹا تو وہ اسلام آباد سیکرٹریٹ میں سیکشن آفیسر تھا، بنگالی ملک چھوڑ گئے تھے اور وہاں کی فضا اسے اپنی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے اپنے اس مشرقی حصے میں تھے جو کٹ کر یا پھر آزاد ہو کر ایک نیا ملک بن چکا تھا۔ اسلام آباد میں اس پر دشمن نے حملہ کیا تو وہ کراچی چلا آیا کہ یہاں اس جیسے اور بھی تھے۔ وہ اگرچہ یہاں آزاد تھا مگر اس آزادی میں بھی اس کے دل پر ایک انجانا بوجھ تھا۔

اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک عام آدمی چاہتا ہے۔ چھت، کام، شناخت۔ مگر ان سب کے درمیان ایک خلا تھا، جو ہر روز اسے اندر کی طرف کھینچتا تھا۔

وہ روز کسی نہ کسی دروازے پر جاتا۔ یہ صرف کوشش نہیں تھی، ایک طرح کا اقرار تھا کہ وہ اب بھی کچھ رشتوں میں بندھا ہوا ہے، اُن لوگوں سے جو کہیں رہ گئے ہیں۔ مگر ہر دروازے پر اس کی کہانی ادھوری رہ جاتی۔

"اختصار سے بتائیں --- اصل مسئلہ کیا ہے؟"

وہ سوچتا، کیا زندگی کا المیہ واقعی مختصر کیا جا سکتا ہے؟ کیا درد کو چند جملوں میں رکھا جا سکتا ہے؟ اس نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا تھا:

"میرا بھائی یوسف مار دیا گیا — میرا باپ کیمپ میں ہے اور میری ماں میرا انتظار کر رہی ہے — اب تو ملک توڑنے والے نہیں رہے۔ حکومت بدل چکی ہے۔"

افسر نے سر ہلایا، ادھر ادھر دیکھا اور یوں کہا جیسے الٹا استفسار کر رہا ہو:

"وہاں کے لوگ یہاں کیسے آ سکتے ہیں؟"

"وہ اس ملک کے شہری ہیں وہاں کے نہیں۔ پاکستان کے وفادار شہری۔"

افسر نے اکتاہٹ سے اسے دیکھا اور فائل بند کر دی:

"اچھا، اچھا، دیکھتے ہیں ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا ایسا کچھ ممکن بھی ہے یا —"

یہ جملے کچھ عرصہ اس کے اندر گونجتے رہے،

پھر کھوکھلے ہو کر ایک خلا بن گئے، ایسا خلا جس میں امید کی ہر آواز پہنچ کر گم ہو جاتی۔
ایک شام وہ سمندر کے کنارے بیٹھا تھا۔ لہریں آتی تھیں، لوٹ جاتی تھیں، بغیر کسی یاد کے، بغیر کسی بوجھ کے۔ اسے اچانک لگا کہ شاید سمندر ہی واحد شے ہے جو کہیں کا نہیں--- اور اسی لیے مکمل ہے۔ اس نے جیب سے پرانا خط نکالا، کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر ٹکڑے کر کے پانی میں پھینک دیا۔ کاغذ کے ٹکڑے کچھ دیر سطح پر ٹھہرے رہے پھر ایک لہر آئی، اور انھیں بہا کر اپنے ساتھ لے گئی۔

صغریٰ بی بی زمین پر اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ایک بے نام سا نقشہ بن گیا تو اس نے دائیں ہاتھ سے مٹا ڈالا اور زمین سے مٹی کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے دیر تک دیکھتی رہیں۔
جیسے وہ اس سے پوچھ رہی ہوں، کیا اصل وہ ہے جو پیچھے چھوٹ گیا یا وہ جو ہمارے قدموں تلے ہے مگر چھوٹ گیا ہے؟
اسی شام، جب کیمپ کی گلیوں میں اندھیرا پوری طرح اتر آیا تھا اور کہیں کہیں کمزور بلبوں کی روشنی دیواروں سے چمٹ کر رہ گئی تھی، محمود علی دروازے کے پاس چارپائی پر بیٹھا تھا۔ صغریٰ بی بی اس کے قریب آ کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر صغریٰ بی بی نے آہستہ سے کہا:
"تمھیں یاد ہے--- تم کہا کرتے تھے، ہم جلد چلے جائیں گے؟"
محمود علی نے اس کی طرف دیکھا نہ سر اٹھایا:
"ہاں--- یاد ہے۔"
"وہ جلد کب آئے گا محمود؟"
اس کی آواز میں تھکن گونج رہی تھی--- گہری، بوجھل اور پرانی تھکن۔ محمود علی نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ایک عجیب خالی پن تھا، جیسے وہاں سے بہت کچھ نکل چکا ہو۔
"شاید--- ہم وقت کو غلط سمجھتے رہے۔ ہمیں لگا تھا وقت ایک سیدھ میں چلتا رہے گا، ماضی سے مستقبل کی طرف۔"
وہ رک گیا، پھر دھیرے سے بولا جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو:
"مگر شاید وقت کہیں نہیں جاتا، ہم ہی اس کے اندر قید ہو جاتے ہیں۔ یا پھر یہ ہمارے اوپر ٹھہر جاتا ہے ہمیں اپنے بھاری قدموں تلے کچلنے کے لیے۔"
صغریٰ بی بی نے مٹی اپنی ہتھیلی میں بھینچی مگر اسے لگا جیسے مٹی نے اسے اپنی مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔
"اور ہم وقت کے کس پارچے میں پڑے ہیں اور کس زمین پر؟"
اُس کا تلخ سوال جیسے ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ہوا میں معلق رہا۔ محمود علی نے لمبی سانس لی جیسے ہوکا بھرا ہو اور کہا:

''نہ وہاں--- جہاں سے ہمارا شوق ہمیں کھینچ کر یہاں لایا تھا اور نہ وہاں، جہاں ہم جانے کے منتظر ہیں۔''

''پھر---؟''

محمود علی نے آنکھیں بند کرلیں اور آنکھوں کا گیلا پن باہر ٹپکنے دیا۔

''شاید بیچ میں---''

صغریٰ بی بی نے ایک لمبی سانس لی۔

''بیچ میں بھی تو کوئی جگہ ہوتی ہے، محمود۔ یہ کیسی جگہ ہے جہاں ہم ہیں؟''

محمود علی نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر الفاظ جیسے اس کے گلے میں ہی کہیں اٹک گئے تھے۔ پھر بہت دیر بعد بولا:

''یہ جگہ نہیں ہے--- مسلسل انتظار کی اذیت ہے۔ شاید اذیت کا یہ برزخ ہی ہمارا بخت اور ہماری وفا کا صلہ ہے۔''

صغریٰ بی بی نے محمود علی کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتی رہی جیسے پوچھنے کو کچھ نہ بچا ہو مگر پھر اپنے وسوسے کو الفاظ دیے اور کہا:

''تو کیا ہم کبھی کہیں نہیں پہنچیں گے؟''

محمود علی نے اس بار فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ تنگ گلی سے اندر جھانکتی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ دور سے آتی ہوئی کسی بچے کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔ جب کئی لمحے بے صدا گزر گئے تو اس نے سرگوشی کی:

''شاید پہنچنا ہی غلط سوال ہے---''

''تو صحیح سوال کیا ہے؟''

صغریٰ بی بی نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ محمود علی نے اس کی ہتھیلی میں دبی مٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ--- کہ--- ہم--- جو بچا ہے وہ کہاں رکھیں؟''

صغریٰ بی بی نے مٹھی کھول دی۔ اور دوسرے ہاتھ کی انگشت سے مٹی کے ذرات اپنی ہتھیلی پر پھیلا لیے۔ پھر یکدم ہتھیلی الٹ دی۔ مٹی زمین پر بکھر گئی۔

''یہیں---اسی جگہ''

اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی، اس نے جملہ مکمل کیا:

''یہیں جہاں ہم ہیں۔''

اسی لمحے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ مٹی کے کچھ ذرے بکھر گئے، کچھ وہیں رہ گئے۔ محمود علی نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا:

''شاید ہم جیسے انسانوں کا مقدر یہی ہوتا ہے۔ کچھ حصہ کہیں رہ جاتا ہے کچھ کہیں اور جا کر بکھر جاتا ہے۔''

صغریٰ بی بی نے اسے دیکھا مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ دور کہیں فجر سے پہلے کی ہلکی سی ہوا چلنے لگی تھی۔ ایسی ہوا جو نہ رات کی تھی، نہ دن کی۔ اور اسی بیچ کے لمحے میں، وہ دونوں پہلی بار یوں بیٹھے تھے جیسے کہیں پہنچنے کے کاٹھ جیسے انتظار کو دیمک نے چاٹ کر کھوکھلا کردیا تھا۔

☆☆☆☆☆

خالی، مگر جاگتی ہوئی

کمرے میں رات سرسرا رہی ہے، اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دیواروں کے اندر کوئی خاموش سانس چل رہی ہو۔

دن بھر کی تھکن صرف جسم میں نہیں، میرے وجود کے کسی دھندلے گوشے میں بھی آ ٹھہری ہوئی ہے — ایک ایسا گوشہ جہاں برسوں سے کوئی نئی کہانی آنکھ نہیں کھول سکی، جہاں لفظ پت جھڑ کے سوکھے پتوں کی طرح پڑے رہتے ہیں۔

نائٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں، میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو ایک بے نام سا خلا میرے اندر کروٹ لینے لگتا ہے؛ ایسا خلا جو شاید مدت سے خاموش آواز میں مجھے پکارتا آ رہا ہے۔

''بابا، کہانی سنائیں۔ نیند نہیں آ رہی۔''

بیٹی عنایہ اپنی نیم خوابیدہ آواز میں کہتی ہے۔

''آج نہیں، بیٹیا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ سارا دن فائلوں میں دبا رہا، ساری شام باتیں کرتا رہا۔ سر ابھی تک گھوم رہا ہے۔ کل سن لینا کہانی۔'' میں جواب دیتا ہوں۔

''آپ نے کل بھی یہی کہا تھا۔''

''جانتا ہوں... اور شاید اسی لیے میری معذرت بھی تمھیں بے جان سی لگتی ہوگی۔''

''پھر بھی کہانی تو آج آپ کو سنانی پڑے گی۔''

''اچھا — ٹھیک ہے۔ کون سی کہانی سنو گی؟''

''کوئی بھی۔''

''اس 'کوئی بھی' کا کیا مطلب؟ کچھ بتاؤ — کہانی کس بارے میں ہو؟''

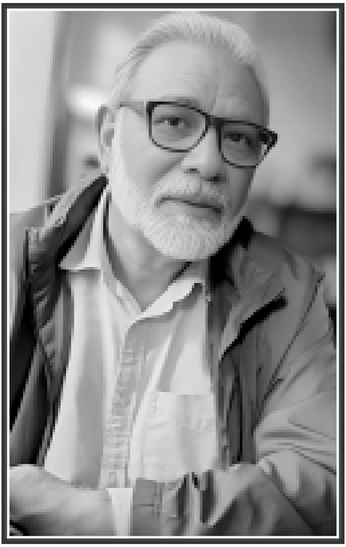

حامد یزدانی

’’کسی بارے میں نہیں۔‘‘

’’کسی بارے میں نہیں؟‘‘

’’ہاں۔ اس میں کوئی انسان نہ ہو۔‘‘

’’کوئی جانور بھی نہیں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’تو... خالی کہانی؟‘‘

’’ہاں۔ خالی۔‘‘

’’بے رنگ؟‘‘

’’نہیں۔ بے رنگ نہیں۔ بس... خالی۔‘‘

’’دکھنے میں کیسی ہو؟‘‘

’’پتا نہیں۔ شاید ویسی، جیسی آنکھیں بند کرنے پر دکھائی دیتی ہے۔‘‘

’’ہلکی؟ یا بھاری؟‘‘

’’نہیں، بے وزن۔‘‘

’’شکل؟‘‘

’’نہیں، کوئی شکل نہیں۔‘‘

’’بال؟ کان؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’دانت؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’پھر کھاتی کیسے ہے؟‘‘

’’کہانیاں دانتوں سے تو نہیں کھاتیں۔‘‘

’’ہاتھ؟‘‘

’’ہاتھ بھی نہیں۔ بابا... کہا نا یہ کچھ بھی نہیں۔‘‘

میں ایک بوجھل سی سانس لیتا ہوں، جو کہیں اندر ہی اٹک جاتی ہے۔

مجھے لگتا ہے عنایہ میری تھکن کو لفظوں سے نہیں، خاموشی سے پڑھ رہی ہے۔

ایک ہلکی سی گھبراہٹ میرے اندر اٹھتی ہے:

شاید وہ کسی ایسی جس سے میں برسوں سے نظریں چراتا آ رہا ہوں؛ وہ جگہ جہاں کبھی خواب خود بہ خود جمع ہو جایا کرتے تھے۔

اب وہاں صرف ایک بے خواب خاموشی ہے۔

ایک خاموشی جو عنایہ کے سوالوں سے زیادہ گہری،

اور میری تھکن سے زیادہ پرانی ہے۔

’’کہانی بغیر کسی چیز کے کیسے ہو سکتی ہے، بیٹی؟ کہانی کو اپنے وجود کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے۔‘‘

’’اس میں کوئی نہیں ہوتا، کچھ نہیں ہوتا۔‘‘

’’یہ کیسی کہانی ہے؟‘‘

’’خالی—‘‘

یہ بڑبڑاتے ہوئے عنایہ دھیرے سے کروٹ بدلتی ہے، جیسے کسی اندرونی تصویر کو دیکھ رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں بچوں والی حیرت نہیں،
صرف ایک ایسا سکوت ہے جو لفظوں سے
پہلے جان لیتا ہے۔
وہ ’’خالی‘‘ کو یوں کہتی ہے جیسے اسے
پہچانتی ہو،
جیسے خلا عدم نہیں، وجود ہو۔
پہلی بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ
شاید کہانیاں سنائی جانے سے پہلے یاد کی
جاتی ہیں۔
دیواروں میں ایک مدھم سی گونج ابھرتی ہے،
یا شاید وہ خاموشی ہے جو کبھی پورے طور
خاموش نہیں ہوتی۔
’’عنایہ… بیٹی! تم جاگ رہی ہو؟‘‘
اس کی سانسیں نیند کی دھیمی لے میں ڈھل
چکی ہیں۔ بند آنکھوں کے اس پار کہیں نائٹ
لائٹ کی مدھم موجودگی اب بھی قائم ہے۔
اور بیداری اور خواب کے درمیان اس
تیرتے ہوئے اس لمحہ میں، مجھے سمجھ نہیں آتا
کہ اب کیا جاگ رہا ہے۔
سوائے کہانی کے۔
کہانی جاگ رہی ہے۔
وہ بہت دیر سے جاگ رہی ہے۔
خاموشی کو سن رہی ہے۔
اندھیرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔
یہ احساس کہیں باہر سے نہیں آیا۔
یہ میرے اندر ہی کہیں سانس لے رہا ہے،
یہ کہانی عنایہ کی خواہش سے پیدا نہیں ہوئی۔
یہ میری اپنی شکست سے ابھر رہی ہے۔
اور شاید اسی لیے مجھ سے زیادہ جاگ
رہی ہے۔
ایک لمحہ کے لیے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کہانی
سنانے والا نہیں، بلکہ وہ ہوں جسے کہانی یاد کر
رہی ہے۔
وہ سب کچھ یاد رکھتی ہے۔
میری تھکن
میری شکست
اور میرے اندر کی وہ خالی جگہ
جسے میں کبھی کوئی نام نہیں دے سکا۔
اور جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں،
تو اندھیرے میں صرف ایک چیز باقی رہ
جاتی ہے:
کسی کے ہونے کا وہ مانوس، نامانوس سا احساس
جو خاموشی سے میرے اندر ابھر رہا ہے،
وہی جسے میں کبھی خلا سمجھتا تھا،
وہی جو اب بولنے کو ہے۔

☆☆☆☆☆

بلیک اینڈ وائٹ

گھر دیر سے آنا اُس کی زندگی کی معمول تھا پر آج تو وہ بہت اُداس اور پریشان واپس لوٹا۔ دیر سے آنا اُس کی نوکری بھی تھی اور مجبوری بھی۔ گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ اوپر سے اُس کے سینے پر بڑھتا ہوا دباؤ بھی۔ گھر واپسی پر کسی نے اُس کا استقبال نہ کیا۔ استقبال تو اُس کا ہوتا ہے جو گھر کچھ لے کر آئے اور جس کا خالی ہاتھ لوٹنے کا اندیشہ ہو اُس کا انتظار بھلا کون کرے۔

اسی، نوے کی دہائی بھی کیا دہائی تھی۔ اُس کا کام عروج پر تھا۔ مین روڈ پر، قصبے کے اڈے کی مین مارکیٹ کے سامنے والی دکان اسی وجاہت ہاشمی کا فوٹو سٹوڈیو تھا۔ سب سے پرانا فوٹوگرافر ہونے کے ناطے وہ گاہک کو بہت خوب صورت کام کر کے دیتا تھا۔ رنگ چاہے اُس کا گندمی مائل تھا پر ایک وجاہت تھی اُس کی صورت میں...... اُس کی چال میں۔ البتہ مزاج بس ایسا تھا کہ اپنے موڈ میں رہنے والا، اپنے کام میں مست۔ اُس دور میں بھی جب وہ اپنے ویسپا سکوٹر پر آتا اُس کی ایک اپنی ہی ٹھاٹھ باٹھ تھی۔ عموماً سفید لٹھے کے کلف لگے سوٹ میں، آرام سے دس گیارہ بجے شاپ پر ایسے آتا جیسے وہ تھانیدار ہو۔ آتے ہی اپنے ساتھ لائے ہوئے اعلیٰ معیار کے چار پانچ پان دکان کی میز کے دراز میں سنبھالتا ایک پان بڑی ادا سے ریپر سے نکال کر اپنے منہ میں رکھتا۔ صفائی کے کپڑے سے اپنے ہاتھ کی پوریں ایک ٹکر سے صاف کرتا پھر اپنی سیٹ پر کپڑا مارتا۔ اپنے چھوٹے سے سٹوڈیو کی طرف متوجہ ہوتا۔ دکان کی معمولی جھاڑ پونچھ کرتا۔

نجم رضوی

علاقے کے سکولوں کے بچوں اور بڑوں کے شناختی کارڈ پر لگنے والی اور پارٹی فنکشن کی تصاویر اُسی سے بنوائی جاتی تھیں - وہ شادیوں پر کیمرے کرائے پر بھی دیتا تھا۔ کوڈک اور کونیکا فلمیں سٹوڈیو سے آسانی سے مل جاتی تھیں۔ شادی اور دوسرے کسی فنکشن کی فلمیں بھی وجاہت کو ڈویلپنگ کے لیے دی جاتی تھیں۔ وہ گاہک کو دو تین دن کا ٹائم دیتا تھا اور پھر وہی فلمیں مارکیٹ سے ڈویلپ کروا لاتا تھا۔ تصاویر بڑی کروانے کے لیے اُسی کو دی جاتی تھیں۔

وہ کام بہت شوق اور لگن سے کرتا تھا۔ بڑی تصویر خاص کر شادی کی رنگین تصویر گاہک کو پکڑاتے ہوئے اپنی کرسی کے ساتھ رکھی پلاسٹک بالٹی میں بڑی اَدائے بے نیازی سے پان کی پیک پھینکتے ہوئے کہتا، ”بڑی محنت سے پنسل ورک کروا کر لایا ہوں...... کہ چہرے پر ڈینٹ وغیرہ نہ رہ جائیں۔ ہماری بھابی کہیں ناراض نہ ہو جائے“ سیاہ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لاتے ہوئے یہ فقرہ وہ دُہراتا تھا۔ گاہک کو چاہے فوٹوگرافی کی یہ بات پسند نہ آتی پر وہ خود اپنی بات پر محظوظ ضرور ہوتا تھا۔ وجاہت کے فن کا طوطی پورے شہر میں بولتا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی - نانا تھانیدار رہے تھے۔ انھوں نے ہی اُسے پالا تھا، اس لیے وہ پولیس والا ٹیکا وراثت میں اُن کی زندگی میں بھی در آیا تھا۔ گھر بھی نانا جان نے بنوا کر دیا تھا۔ گھر جاتے ہوئے وہ بیوی بچوں کے لیے پھل ضرور لے جاتا تھا۔ اُس کا دروازہ پر انتظار ہو رہا ہوتا اور ہلکی سی آہٹ پر دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔ زندگی شاہانہ طرز پر گزرتی رہی۔ شادی نوعمری ہی میں ہو گئی تھی۔ بیوی سلیقے سے کمیٹیاں ڈال کر پیسے جوڑتی بھی رہی اور ساتھ ساتھ بچوں کو اچھی تعلیم دلواتی بھی رہی۔

زندگی میں انقلاب آیا اور وقت بدلنے لگا۔ ترقی کے اس جدید دور میں موبائل فون دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں کی زینت بننے لگا۔ کیمرہ، ریڈیو اور گھڑی کی جگہ یہ سیل فون لینے لگا۔ دنیا سمٹنے لگی۔ قصے کہانیاں ختم ہونے لگے اور اپنے تصورات کی نئی دنیا انسانی ہتھیلی میں سمٹنے لگی۔ فوٹوگرافی کی صنعت کا زوال شروع ہو گیا۔ کام کم ہوتے ہوتے سکول کے بچوں کے داخلہ فارم کی تصاویر تک رہ گیا۔ اس پیشے سے وابستہ لوگوں کے کاروبار ڈوبنے لگے او یہ انڈسٹری دیکھتے دیکھتے بند ہونے لگی۔ وہ دور ختم ہونے لگا جب کیمرے کے فلیش میں سب کی آنکھوں میں چمک آ جاتی تھی...... تصویر

بتاتے ہوئے کہتے، !تم بھی آجاؤ..... تم بھی قریب ہو جاؤ...... اور پھر موبائل کا دور شروع ہو گیا۔ ذرا پرے ہونا پلیز سلفی لینی ہے۔ اور سلفی سے Selfish ہونے کا سفر بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ یہ تو اچھا تھا کہ بھلے وقتوں میں اُس نے بیٹوں کی شادی کر دی تھی اور چھوٹی بیٹی بھی بعد میں بیاہ دی گئی۔ بیٹے اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ جب کیمرے کا کام کم ہونے لگا تو دکان کا کرایہ نکالنا مشکل ہو گیا۔ شومئی قسمت دکان والی جگہ ایک نئی مارکیٹ تعمیر ہونے لگی اور وجاہت کو اپنا سٹوڈیو کسی اور جگہ منتقل کرنے کا نوٹس مل گیا۔ سٹوڈیو، مین مارکیٹ سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی دکان میں منتقل ہو گیا۔ وہ نسبتاً کم رونق والا بازار تھا۔ صدمے پر صدمہ کہ چھ سات ماہ بعد ایک رات وجاہت کی دکان میں چوری ہو گئی اور چور دکان کا قیمتی سامان چرا کر لے گئے۔ پولیس تھانہ میں فوٹو گرافر کی ذرا بھی شنوائی نہ ہوئی۔ اس چوری میں تھانے ٹپانے کے چکروں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ فوٹو گرافر کی دنیا سمٹتی سمٹتی جلد ہی اُس کے گھر کے صحن تک محدود ہو کر رہ گئی۔

وجاہت کی عُمر بھی جوانی سے پیری کی طرف رُخ موڑ چکی تھی۔ گھر پڑا رہنے کی وجہ سے گھر والوں کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ بیوی جو سب سے بڑی مونس و غم خوار ہوتی ہے، اُسی کے رویے میں بھی بڑی تبدیلی آ گئی۔ بیوی کو میاں بوجھ لگنے لگا۔ بچے پہلے ہی باپ کی روک ٹوک اور سخت رویے کی وجہ سے اُس سے دُور اور اماں کے قریب تھے وہ باپ سے مزید دُور ہو گئے۔ گھر والوں کو اب وجاہت کے پالنے کی ذمہ داری مل گئی۔ فوٹو گرافر کی بوڑھی ہڈیاں بھی کہاں سے کما کر لاتیں۔ اُسے گھر کے کاموں کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ بچوں کے بچوں کی دیکھ بھال، بازار سے سودا سلف لانا اور یوٹیلیٹی بلز لمبی قطار میں لگ کر جمع کروانے کی اُس کی ایک نئی مصروفیت مل گئی۔ وجاہت کی وہ جوانی کی بچی کھچی انا آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ شاہانہ انداز کھو گئے تھے اور ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

میاں بیوی کا رشتہ بھی دنیا کا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ کہیں قلعہ کی طرح مضبوط اور کہیں ریت کی دیوار کی طرح ناپائیدار۔ البتہ اس تعلق پر بہت سارے اور بھی دینی دنیاوی اُمور اثر انداز ہوتے ہیں۔ فوٹو گرافر سے یا شاید دونوں میاں بیوی سے ایک غلطی تو ضرور ہو گئی تھی کہ کام کاج کی زیادتی میں غرق وہ بچوں کو تعلیم دلوانے میں تو کامیاب رہے تھے لیکن تربیت کرنے میں ناکام ثابت ہوئے تھے۔ سچی بات ہے کہ ادب و

اخلاق سے بڑھ کر کوئی میراث نہیں ہے۔ وہ دونوں سرپرست ہوتے ہوئے بھی اپنے بچوں کو اخلاق اور ادب نہ سیکھا سکے۔ میاں بیوی کے تعلقات پر اثر انداز ہونے والی دوسری اہم چیز معاشی حالات ہوتے ہیں۔ یہ فطرت ہے یا عادت کہ جو انسان معاشی کچھ مضبوط رکھتا ہے وہ گھر کا حاکم بن جاتا ہے اور حالات اکثر اُسی کے کنٹرول میں رہتے ہیں۔ معاشیات پر ڈھیلی گرفت تعلقات کو کمزور کرنے لگتی ہے۔

جب تک فوٹو گرافر کے کردار کا معاشی پہلو مضبوط رہا گھر، بیوی بچوں پر اُس کی گرفت مضبوط اور اُن پر اُس کا رعب برقرار رہا۔ پر زبان تو چپ نہیں رہ سکتی۔ اس کا وزن بھی زیادہ نہیں ہوتا اور اس کو حرکت دینے میں زیادہ قوت بھی نہیں لگتی۔ چیزوں کو خراب ہوتے دیکھتا تو وہ پکار اُٹھتا، ''اوہ! یہ نہ کرو...... وہ نہ کرو...... وہ ٹونٹی بند کرو۔ وہ دیکھو پانی ضائع ہو رہا ہے۔ یہ سوچ، وہ سوچ......'' وغیرہ وغیرہ کسی کو بھی اُس کا ٹوکنا اچھا نہ لگتا۔ جب حالات پلٹا کھانے لگے تو گھر کی فضا بھی تبدیل ہونے لگی۔ بیوی بچوں کی باپ سے فرمائشیں بڑھنے لگیں۔ جن کے پورا ہونے نہ ہونے سے اہلِ خانہ کی طرف سے شکایات کے انبار لگنے لگے۔ بیوی گھر کے حالات کی خرابی کی ذمہ دار میاں کو ٹھہراتی اور بچوں کو شکایت لگاتی۔ اولاد سمجھنے لگی کہ باپ گھر میں نہ صرف فالتو چیز ہے بلکہ گھر کے سکون کا سب سے بڑا دشمن بھی ہے۔ ماں گھر کی مضبوطی کا ایک ذریعہ ہے اگر وہی کمزور ہو جائے تو مضبوطی متاثر ہوتی ہے۔ بچے باپ سے روٹھتے چلے گئے۔ دوسرا اس جدید دور میں موبائل کی وجہ سے بچے اپنی اپنی دنیا میں مگن۔ اور لاپروا ہو جاتے ہیں۔ وجاہت گھر میں ایک ناکارہ پرزہ بن کر رہ گیا۔ ملازمت پیشہ کماؤ بچوں کی نظروں میں اُس کی قدر گھٹتی ہی گئی۔ اُس سے کسی کام کی بابت مشورہ نہ لیا جاتا بلکہ اُلٹا اُسے اپنا حکم سنایا جاتا۔ گھر میں اُس کی حیثیت ایک بغیر تنخواہ کے ملازم کی سی رہ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بہت سی چھوٹی بڑی نازک چیزیں تخلیق کی ہیں لیکن دل کی دنیا میں والدین اور اساتذہ کا دل شاید سب سے نازک بنایا ہے۔ یہ مخلوق اپنی اپنی جگہ اپنے پیاروں کی نظروں کے بدلنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اِن رشتوں کے حصار میں رہتے وجاہت کا دل بھی کبھی لہجوں کے بدلنے سے ٹوٹ جاتا۔ عموماً تو اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر ہی اُس سے بات کی جاتی۔ اُس کو نظر انداز کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو محرومی کے احساس سے بچا نہ پاتا۔ وہ بار بار اذیت کا شکار ہوتا۔ بیوی جیسے

رشتے کی سرد مہری سے وہ تڑپ جاتا اور اپنے کمرے میں بستر کے اندر گھس کر بلک بلک کر روتا۔ تنہا لیٹے لیٹے اُسے لگتا کہ وہ بغیر روح کے ایک جسم ہے۔ اُس وقت اُسے احساس ہوتا کہ بظاہر مضبوط لگنے والا رشتہ اندر سے کتنا کھوکھلا ہے۔ کبھی تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی خدا سے شکوے شکایت شروع کر دیتا۔ جب اُس کا بڑا بیٹا گاڑی پر اور چھوٹا اپنی موٹر سائیکل پر اپنے اپنے دفتر چلے جاتے تو وہ مجبور ہو کر بیوی کے سامنے دوزانو زمین پر بیٹھ جاتا اور پھٹی پھٹی نگاہوں اور روتی ہوئی آواز سے کہتا...... "خدا کی بندی......! مجھ سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے؟ اتنی بڑی سزا - بچوں کو سمجھاؤ! میں اُن کا باپ ہوں۔ مجھ سے اتنی نفرت، میں نے اُن کا......اور تیرا کیا بگاڑا ہے؟؟ تو نے اُن کی ساری نفرت میری طرف موڑ دی ہے۔ خدا کا خوف کر۔ اُن کی اور اپنی عاقبت خراب نہ کر...... اچھی عورتیں ایسا نہیں کرتیں......!! سارا دن ایک ملازم کی طرح گھر کے کام کرتا ہوں۔ پھر بھی کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا...... بچے واپسی پر شاپر لے کر اپنے اپنے کمرے میں گھس جاتے ہیں۔ حرام ہے مجھ کوئی چیز نصیب ہو! جب تک تو میری عزت نہ کروائے وہ میری عزت نہیں کریں گے -" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُس کی بیوی منہ بسورتے ہوئے بولی "ایسے ہی فضول سوچتے رہتے ہو...... ذہنی بیمار ہو گئے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں...... جاؤ، اپنا کام کرو!!" گزشتہ سالوں میں، بچوں کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے پر، بیوی کا رویہ نرمی سے سختی میں ڈھل گیا تھا۔

گھر سے فرار کے لیے وہ قریب ہی ایک پراپرٹی ڈیلر کے دفتر چلا جاتا۔ وہ سیاست پر بات کرتے، وقت اچھا آئے گا امید کرتے۔ گپ شپ ہو جاتی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ وہاں کوئی خاص کام وغیرہ نہیں تھا۔ دو چار دفعہ چائے مل جاتی تھی اور ہلکا پھلکا خرچہ مل جاتا۔ گھر پڑے رہنے سے جسم میں سرایت کرنے والے زہر کو زائل ہونے کا موقع بھی مل جاتا۔ لگاتار پریشانیوں نے اُسے دل کے عارضہ میں مبتلا کر دیا۔ ایک دن سینے میں شدید درد اُٹھا۔ درد کنٹرول سے باہر ہو گیا۔ اُس کو فوری طور دل کے سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ اُس کو ایڈمٹ کر کے ضروری ٹیسٹوں کے بعد آپریشن کر کے دل کی تنگ شریان میں (اسٹنٹ) Stent ڈال دیا گیا۔ وہ ہسپتال سے گھر منتقل ہو گیا۔ ہفتے دو ہفتے بعد چیک اپ ہوتا اور مفت دوائی بھی مل

جاتی۔ اب بیماری میں جب وہ زندگی گھسیٹتا تو وہ اُسے مرض لادوا لگنے لگتا۔ اکثر بڑا بیٹا کوئی ایک یوٹیلیٹی بل دے کر کہتا، ''یہ بل جمع کروا دینا...... اور تین ہزار روپے کم ہیں اپنے پلے سے ڈال لینا......'' وجاہت پریشان ہو جاتا۔ وہ کسی نہ کسی جاننے والے سے پیسے پکڑ کر بل جمع کروا دیتا۔ آخر اُس نے بھی تو رہنا تھا اُس گھر میں۔ اُس کے فوٹو گرافی کے دور کے دوست احباب بھی اُس کے برے حالات سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ دوستوں کو مس کال کرتا اور اُن کے فون آجاتے۔ جب ضرورت ہوتی تو وہ کچھ نہ کچھ مدد کر دیتے۔ وہ اکثر اپنی ختم شدہ دوائی بھی ان پیسوں سے لے لیتا۔

آج پھر وہ گھر سے فرار چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست پراپرٹی ڈیلر کی شاپ پر دیر تک افسردہ بیٹھا رہا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ افسردگی سے پھر اُس کے سینے میں درد اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ باہر ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ دکان میں کافی دیر سکڑ کر بیٹھا رہا۔ گھر جانے کو اُس کا دل نہیں کر رہا تھا۔ معمولی کپڑوں میں ملبوس جب وہ گھر لوٹا تو بیوی نے دروازہ کھول دیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے بیوی سے التجا کے لہجے میں ایک فریاد کر ڈالی...... ''کرما والیے...... دیکھ! سینے میں درد اُٹھ رہا ہے۔ ابھی دوائی لیتا ہوں۔ ایک انڈہ اُبال دے...... چائے بنا دے...... موٹی رضائی میرے اوپر ڈال دے'' اُس کے منہ سے ''ہائے ہائے'' کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اونچا بولنے کی آوازیں برآمدے سے کمروں تک جا رہی تھیں۔ چھوٹا بیٹا اُٹھ گیا۔ اونچی آواز سے بولتا کمرے سے برآمد تک آگیا۔ ''کیا ہو گیا ہے؟؟ کیسا شور ہے؟؟ باپ کو دیکھتے ہی حقارت سے بولا۔ ''آگئے ہیں نواب صاحب!! نہ کام نہ کاج...... سکون سے سونے بھی نہیں دیتے!'' بڑبڑاتے ہوئے وہ دوبارہ کمرے میں گھس گیا۔ بیوی بھی اُس کو نظر انداز کرتے اور چہرے کا رُخ دوسری طرف کرتے ہوئے بولی...... جاؤ کیا سارے گھر کو ڈسٹرب کر رکھا ہے......''

وہ مسلسل درد سے کراہتا رہا...... نہ وہ کہیں جا سکتا تھا اور نہ کوئی اُس کے ساتھ اس وقت ہسپتال جانے کو تیار تھا۔ مجبوراً اُسے اپنے بستر کی طرف جانا پڑا۔ ایک طرف اُس کا بستر تھا تو دوسری طرف برآمدے کے کمروں میں لیٹے دوسرے افراد۔ قدرت کی بنائی یہ مورت گیراج کے ساتھ والے کمرے میں، زمین پر بچھے، گرد سے اَٹے بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

☆☆☆☆☆

آخری پرچہ

جب وہ دسویں جماعت کا آخری پرچہ دے رہا تھا۔ تو بال پین دانتوں میں دبا کر وہ اپنے تمام ہم جماعتوں کو باری باری غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سوال کا جواب بھول کر اپنے دل کی خوفزدہ حالت اور گونجتی ہوئی دھڑکن کے ساتھ ایک اندھیرے میں گم سا ہونے لگا تھا۔ آخری پرچے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ اس کے پاس کرنے اور سوچنے کو کچھ نہیں۔ ایک خلا اُسے اپنے سامنے پھیلا ہوا نظر آنے لگا۔ بہت دیر سے رُکی ہوئی سانس اچانک ایک آہ کے ساتھ دوبارہ جاری ہوئی تو آس پاس کے لڑکوں نے اُسے ملی جلی طنزیہ اور قابلِ ترس نظروں سے گھورا۔ ایک نگران تیز تیز چلتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ اور جھڑکتے ہوئے بولا"اب اگر دوبارہ تم نے کوئی آواز نکالی۔ تو میں پرچہ چھین کر تمھیں ہال سے باہر نکال دوں گا" اس کا جسم لرز گیا، گال تپ گئے۔ خوف اور مایوسی سے اسے بخار ہو گیا اور وہ سسکتے ہوئے زندگی کی بھیک مانگنے والوں کی طرح ممیاتے ہوئے بولا،سوری سر، دوبارہ نہیں کروں گا،نگران کو نگاہوں میں رحم پیدا کرنے کی خواہش میں وہ پرچے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی سنجیدہ اداکاری کرنے لگ گیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دائرے بنانے میں مصروف تھا، ہاتھ تھک گیا تو وہ پھر اپنے ہم جماعتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سب امید اور اعتماد کے ساتھ گردنیں جھکائے لکھنے میں مصروف تھے چند دوست اس کے بہت قریب تھے، جن سے وہ ہمدردی اور اخلاص کے دوستانہ رویہ کو محسوس کرتا تھا۔ وہ بھی اب اُسے فاصلہ بناتے ہوئے، دور جاتے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ وہ بیچارگی، محرومی کے ایک نئے تجربے سے گزرنے لگا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ آخری پرچے کے بعد وہ بہت سی چیزوں سے محروم ہو جائے گا۔ اپنے پرانے دوستوں کی صحبت، ان کی شرارتوں پُرخلوص اور معصومانہ حماقتوں کے پُرلطف دن ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ آخری پرچے کے بعد اس کے قریبی دوستوں کے اپنے منصوبے تھے۔ کسی نے اپنے ماموں کے گھر جانا تھا، کسی نے خالہ کے گھر جانا تھا، بہت سوں نے دوستوں رشتہ داروں کے گھروں میں جا کر دعوتوں، شادیوں اور تقریبات میں ناچنا گانا تھا۔ دولت مند گھروں سے تعلق رکھنے والوں نے خوبصورت اور مشہور مقامات کی سیر کو نکلنا تھا۔ کچھ نے ٹیوشن اکیڈمیوں میں داخلہ لینا تھا،

کلیم خارجی

بہت سے لڑکے جانتے تھے کہ پریکٹیکل کے بعد ان کے اصل پریکٹیکل کا زمانہ شروع ہونے والا تھا۔ جب انھیں یہ پتہ چلے گا کہ طاقت، دولت اور مرتبہ حاصل کرنے کے لیے کون سا شعبہ اور پیشہ کب اور کیسے اختیار کرنا تھا۔ اپنے بارے میں سوچ کر کہ اس کے آدھے بھرے ہوئے معدے، خالی جیب اور سوکھے ہوئے جسم کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گرم پانی سا پھیلنے لگا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے پاس زندگی کے بوجھ، دکھ، بے چارگی اور بے بسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس کے غریب باپ اور پسماندہ سی ماں کا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی کوئی خوشی یا کوئی صحت مند تبدیلی آسکے۔ سوچتے سوچتے وہ اپنے تمام دوستوں کو کھوئے جانے کے دکھ میں مبتلا ہو گیا۔ جن کی صحبت میں بیٹھ کر وہ چند گھنٹوں کے لیے اپنی بے وقعتی، بے مقصدیت اور غربت کو بھول جایا کرتا تھا۔

اس نے کچھ دوستوں کو پرچہ پوری طرح حل کر کے فتح مندی سے اُٹھتے ہوئے دیکھا تو وہ کانپ سا گیا۔ اس کے پاس لکھنے کو جو کچھ تھا۔ اُس کے ہاتھ لکھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے تمام دوست خوش قسمتی کے ستاروں کے مالک تھے۔ سب کے باپ جب گھروں کو لوٹتے تھے تو ان کے تھیلوں اور جیبوں میں کچھ نہ ہوتا تھا۔ سب کے اپنے مرتبے اور وسیلے تھے۔ سب اپنے بچوں کے لیے اُمید، حوصلے اور خوشیاں لے کر آتے تھے۔ ان کے پاس اپنے جوان ہوتے بچوں کے لیے وہ سب کچھ تھا جو ان کی کامیابی اور خوشحالی کے کام آسکتا تھا۔ سب کے باپ ان کے لیے آسانیاں اور آسائشیں ڈھونڈنے میں کامیاب تھے۔ اس کے سامنے اپنے بوڑھے ہوتے باپ کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ہال کی چھت کو گھورنے لگا۔ اس کا جبڑا کس گیا۔ اس کا باپ مہینے کے بعد کپڑے بدلتا تھا۔ اس کے پاس دو ہی جوڑے تھے، اس کے پاس جوتے بھی ایسے تھے۔ جن کی وہ بار بار مرمت کروا چکا تھا۔ وہ اپنے شہر سے دور دوسرے شہر کی منڈی میں ٹرک خالی کرنے کی مشقت کرنے صبح سویرے اُٹھ جاتا تھا اور شام کے اندھیروں میں تھکن، بھوک اور غربت کے شدید دکھ کے ساتھ واپس لوٹتا تھا۔ اپنے باپ کی مشقت اور غربت کو کم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سوائے اس عمل کے وہ صبح اپنے باپ کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتا۔ اُسے سائیکل پہ بٹھا کر دوسرے شہر جانے والی گاڑیوں کے اڈے تک پہنچاتا۔ اور پھر شام کو اُسے لینے چلا جاتا۔ اُسے خوف رہتا تھا کہ اس کا باپ جو سارا دن خوف، احتیاط، بھوک اور جسمانی مشقت کے بدلے میں چند روپے لاتا ہے۔ کہیں گھر آنے کا راستہ نہ بھول جائے۔ اپنے باپ کو سائیکل پہ بٹھا کر گھر سے لے جانے اور واپس آنے کا اس کا اہم اور ابدی فرض تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے پاس زندگی کا کوئی مشغلہ اور منصوبہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے بہت

عرصہ تک اپنے باپ کے جھکے ہوئے، ٹوٹے ہوئے جسم اور بے بسی کے مارے دل کو ایک سہولت دیتے رہتا ہے۔ کب تک وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

دانتوں میں پین تھماتے ہوئے اُسے ایک نئی سوچ کا تجربہ ہوا۔ تو اس کا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ کمر میں ہلکا سا درد ابھر آیا، اس کا باپ گھر پیدل اس لیے نہیں لوٹ سکتا کہ وہ سارا دن خوف اور محرومی کے احساس لیے بوجھ ڈھوتا رہتا ہے۔ یوں اس کا جسم، دل اور دماغ سب کچھ تھک جاتا ہے۔ اس کے باپ کو ہر روز یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پیسہ کمانے کا جو کمزور سا وسیلہ اس کے ہاتھ لگا ہے وہ اسے چھن نہ جائے۔ اس کی زبان سے کسی کو اشتعال نہ آ جائے۔ کوئی اس سے جھگڑ نہ پڑے۔ جو کچھ اُسے ملتا ہے اگر کسی نے چھین لیا تو اس کے پاس لڑنے اور واپس حاصل کرنے کی طاقت ہے نہ حوصلہ۔ اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر وہ سچ مچ رو پڑا۔ اس کے آنسوؤں سے پرچہ گیلا ہو گیا۔ نگران دوبارہ اس کے پاس آیا اور ہدایت دیتے ہوئے بولا پرچہ مشکل ہے، تو فیل ہو جانے سے موت نہیں آ جاتی۔ ہر سال ہزاروں لڑکے فیل ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بے چارہ بنا کر رونا بند کرو۔ اور پرچہ درست کر کے میرے حوالے کر دو۔ دیکھو پرچہ مکمل کر کے ہال سے نکلتے جا رہے ہیں۔

بس پانچ منٹ سر، کہ کر اس نے اپنے آپ کو کوستے ہوئے پرچہ سیدھا کیا۔ گیلی جگہ چھوڑ کر اس نے دوبارہ دائرے بنائے، دائرے بناتے بناتے اس نے پرچے میں لکھنا شروع کر دیا۔ ''میں پاس ہو کر کیا کر لوں گا۔ میرے پاس ہو جانے سے مجھے اور میرے غریب اور بوڑھے ماں باپ کو کیا مل جائے گا۔ میرے فیل ہونے سے کسی کو دکھ بھی نہیں ہوگا اور میرے پاس ہونے سے کسی کو خوشی بھی نہیں مل سکتی۔ میں اپنے باپ کی مشقت اور غربت میں شریک ہوں۔ لیکن میرے پاس اس کے سہارا بننے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں۔ میں نے محنت، مزدوری اور نوکری کرنے کے لیے ابھی سے، بل کہ بہت پہلے سے کوشش شروع کر رکھی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا۔ آج میرا سب کچھ لٹ سا گیا ہے۔ مجھے میرے اچھے اور عزیز دوستوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ نظر آ رہا ہے۔ سکول کے دن اچھے تھے، بہت اچھے تھے۔ میں صبح آٹھ بجے سے، ڈھائی تین بجے تک، جھوٹ سچ کی گپ کے مزے اُڑاتا تھا۔ پُرخلوص دوستوں کے صحبت میں اپنی بدحالی، بھوک، مایوسیوں اور آنے والی مصیبتوں کو بھول جایا کرتا تھا۔

اب میرے باپ کی طرف سے مجھ پہ یہ ذمہ داری دنیا میں میرے لیے سب سے زیادہ اہم اور تکلیف دہ ہے، میں سوچتا ہوں کہ میرے باپ کو گھر سے نکلتے اور گھر میں آتے ہوئے بہت سے خوف گھیرے رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اور خود کو اس زمین پہ سب سے کمزور، بے سہارا اور کسی ان

دیکھے ظالم کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوا محسوس کرتا رہتا ہے۔ وہ ڈرتا رہتا ہے کہ کوئی مجھے یا اُسے کسی جرم میں ملوث نہ کر دے۔ ہمیں کوئی سزا نہ مل جائے۔ وہ ہجوم اور اجنبی لوگوں سے بہت دور رہتا ہے کہ کہیں مجھ پر یا اس پر کفر اور گستاخی کا الزام نہ لگ جائے۔ احتیاط کے طور پر اس نے میرے اور اپنے گلے میں لٹکانے کے لیے کئی سال پہلے سورۂ یٰسین کے تعویذ بنا لیے تھے۔ جو ہم دونوں کے حوصلے اور اُمید کا واحد ذریعہ ہیں۔ ہمارے گھر کی کچی دیواریں ایک دھکے کی مار ہیں۔

میرے چار بڑے بھائی اور تین بڑی بہنیں ہیں۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میرا غریب اور سہا ہوا باپ صرف میرا باپ ہے اور میں اس کا واحد اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے اپنا سہارا بنائے ہوئے ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ تو میرا باپ کس قسم کی زندگی گزارا کرتا تھا۔ میرے بہن بھائی کیسے پیدا ہو گئے۔ کیسے بڑے ہو گئے اور اب میں، میرا باپ اور میری ماں کیسے ہم تین رہ گئے ہیں۔ میری ماں بوڑھی اور کم پڑھی لکھی ہے۔ اُسے نیک، عبادت گزار بننے کا شوق ہے۔ لیکن مجھے اور خاندان میں آج تک کوئی بڑا مقام نہیں ملا۔ اُسے لوگ خوشی سے کسی دعوت یا تقریب میں شریک ہونے کا نہیں کہتے، جب کہ نہ تو وہ چور ہے اور نہ ہی وہ کسی سے کچھ مانگتی ہے۔ میرا باپ، میری ماں اور میں، ہم بغیر کسی کے مشورے، امداد، حوصلے اور تعارف کے جی رہے ہیں۔ ہم صبح کو شام کا انتظار کرتے ہیں۔ انتظار جو مایوسی، خوف کے درمیان ہمیں سہنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی اور حالات کئی ہزار سال پرانے ہیں بدلتے ہی نہیں۔۔۔

ہال میں کرسیوں کے کھینچے جانے سے شور پیدا ہوا تو اس نے اپنی گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اس کے آس پاس کی کرسیاں خالی ہو چکی تھیں۔ دور بہت آگے اس کے بہترین دوست عبداللہ، نیاز اور حسیب قریب قریب کرسیاں جوڑے بیٹھے تھے۔ ایک نگران ان کے قریب کھڑا تھا۔ جب کہ وہ تینوں کتاب سے دیکھ دیکھ کر پرچہ میں کچھ لکھتے جا رہے تھے۔ وہ اُنھیں رشک اور خوشی سے دیکھنے لگا۔ اُسے بہت اچھا لگا۔ جلنے اور حسد کا احساس جو اس عمر میں اس موقع پر بہت شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا دل و دماغ کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ نگران نے اُسے گھورا تو وہ ڈر کے اپنے پرچے پہ دوبارہ دائرے کے اندر سے دائرے بناتے ہوئے لکھنے لگا۔

میرے تینوں دوست بہت اچھے اور مہربان ہیں۔ عبداللہ اور نیاز دونوں کزن ہیں۔ دونوں کے والد سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ وہ دونوں بہت دولت مند اور خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں دل کے بہت فیاض ہیں۔ اُنھوں نے کئی بار مجھے فالودہ کھلایا ہے۔ دونوں نے کئی بار میری مدد بھی کی ہے۔ اُنھوں نے احسان کر کے کبھی جتایا نہیں۔ اور ضرورت کے وقت مجھے کچھ بھی دے کر واپس نہیں مانگا۔ حسیب کتنا خوب صورت اور مہمان نواز ہے۔ وہ اچھے خوب صورت اور صاف کپڑے پہن کر

شہزادہ لگتا ہے۔ اس کے بدن سے ہر وقت خوشبو لپٹی رہتی ہے۔ اس کا جسم کتنا دلکش، سفید، تندرست اور گداز ہے۔ اُسے گلے ملنے کے بعد دیر تک لپٹائے رکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اس کے ابو کا بہت بڑا ہوٹل ہے۔ جو حاجی ہوٹل کے نام سے مشہور ہے۔ حسیب کئی بار مجھے ہوٹل لے گیا ہے۔ اس نے کئی بار مجھے اور اپنے بہت سے دوستوں کو کھانا کھلایا ہے۔ وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ نہ کسی سے لڑتا ہے۔ نہ کسی کو نیچی نظر سے دیکھتا ہے۔ میں ہر صبح دیر تک اُس کے ساتھ گلے ملتے ہوئے اس سے چمٹ جاتا تھا۔ اُسے کبھی بُرا نہیں لگا۔ میرا یہ زمانہ --- یہ وقت کتنا یادگار --- دکھی کر دینے والا ہے۔ لیکن میں خوش ہوں کہ میرے یہ تینوں عظیم دوست اچھے نمبروں سے پاس ہو جائیں گے۔ انھیں نمبروں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ آج بیالوجی کا پرچہ ہے۔ بہت مشکل مضمون ہے۔ لیکن میرے دوست کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ ان کے ارادے بہت بلند ہیں۔ اور وہ بہت آگے تک جا سکتے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا دکھ ہے کہ میں ان دوستوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ آج کے بعد مجھے ان کے قریب جانے کا موقع نہیں ملے گا۔ رستوں اور بازاروں میں دور دور سے جلدی میں ملاقات ہوا کرے گی۔ ہماری دوستی کب اور کیسے شروع ہوئی - مجھے پتہ نہیں - لیکن ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہونے والے ہیں۔ مجھے اس بات کا پتہ نہیں۔ ہمارے استادوں نے ہمیں ناکام ہونے کی خوف میں مبتلا رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے کبھی ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور دوستی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہماری دوستیاں جیسے خود بخود شروع ہو گئیں تھیں۔ ویسے ہی آج کے بعد ختم ہونے والی ہیں۔ ہمارے پاس ایسا کچھ نہیں کہ آیندہ بھی ہم اتنے پرخلوص اور محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل سکیں۔ میں اپنے سے زیادہ بلند، اپنے سے زیادہ عزت اور دولت والوں کا دوست کیسے رہوں گا۔ اس بات کی ہمیں سکول اور استادوں سے کوئی تعلیم اور ہدایت نہیں ملی۔ جب کہ میں نے ہمیشہ استادوں کا احترام کیا ہے، ان کی فرمانبرداری کی ہے، لیکن میرے استادوں نے مجھے آئندہ زندگی کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں دی جو میرے لیے یادگار اور مفید ہو، میرے سرکاری سکول کی عمارت میں میرے لیے کچھ نہیں رہا۔

میں اکیلا رہ جانے والا، بچھڑ جانے والا آدمی بن کر اپنے گزرے ہوئے زمانے کی یاد میں جیتا رہوں گا۔ اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ خوفزدہ ہو کر اس نے دوبارہ اپنے آنسو پونچھ کر ہال کا جائزہ لیا۔ تو صرف پانچ سات لڑکے بیٹھے رہ گئے تھے۔ جو منت اور خوشامد سے نگرانوں کو مہربان رہنے پہ مجبور کیے جا رہے تھے۔ اس کے سب دوست جا چکے تھے۔ ہال میں رہ جانے والوں میں سب اجنبی تھے۔ دوسرے سکولوں کے طالب علم تھے۔ خود غرض سے، موقع شناس اور عزت نفس سے خالی --- وہ اپنے سے بولا،

ریاض علی، اب تمھارا کوئی نہیں رہا۔ اب ہال خالی ہو رہا ہے۔ تم نے بیالوجی کے پرچے میں اردو دے ماری ہے۔ لیکن کچھ تو لکھا ہے۔ اب اُٹھو--- اور پرچہ نگران کے حوالے کرنے کی ہمت کرو--- دنیا میں کچھ لوگ پاس اور کامیاب ہونے کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ فیل اور ناکام ہونے کے لیے--- جان بوجھ کر فیل ہو جانے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے---واہ---"

ایک نگران نے اعلان کیا۔ آخری پندرہ منٹ--- بس اب پرچوں کو ترتیب دے کر صفحوں کو جوڑنا شروع کرو--- نگران کی آواز سن کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس کا منہ خشک ہو گیا۔ کانوں میں سنسناہٹ سی گونجنے لگی۔ اور جسم بخار میں تپنے لگا۔ اس نے کسی اُمیدوار کے سہارے کی آس میں ہال کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ لیکن اُسے کوئی مانوس چہرہ نظر نہیں آیا۔ اجنبی لڑکے اپنی کتابوں کے صفحے پھاڑ پھاڑ کر ہوا میں اُچھال رہے تھے۔ اس کے کئی دوستوں نے بھی ہال سے نکلتے ہوئے کتابوں کے پُرزے ہوا میں اُڑائے تھے۔ ان کتابوں میں خوفناک بھوت بند تھے۔ آج انھیں چیر پھاڑ کر نجات اور سکھ کا سانس لیا جا رہا تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے خود سے بولا--- میں نے بھی یہ کام کرنا تھا۔ لیکن اب میرا کوئی دوست نظر نہیں آ رہا۔ ایسے کام تو اچھے اور گہرے دوستوں کے ساتھ مل کر سرانجام دینے کا مزہ آتا ہے۔ نگران کی آواز آئی---

آخری پانچ منٹ--- ریاض علی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے جسم کو سنبھالتے ہوئے سرگوشی کی۔ ریاض علی ہال سے باہر کیسے جاؤ گے۔ وہاں تو ایک مسلسل محرومی کھڑی ہے۔ کوئی دوست نہیں رہا۔ سب اپنی راہوں کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ میں اکیلا--- قافلے سے بچھڑ گیا ہوں۔ اس کے آنسو ٹپکنے لگے۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ ایک نگران اس کا پرچہ اُٹھا کر لے جا چکا ہے۔ وہ تھکے ہوئے، ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح آہیں بھرتے اُٹھنے لگا تو کرسی پہ گر پڑا۔ کرسی اس کے بوجھ سے اُلٹ گئی۔ تو ہال میں گونج پیدا ہو گئی۔ نگرانوں نے غصے سے مڑ کر دیکھا۔ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ نگرانوں نے باہر کھڑے ہوئے لڑکوں کو اندر بلا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ لیکن اس کے جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ ابھی ہوش میں تھا۔ اس کے نتھنوں کے اندر ہال میں پھیلی ہوئی کتابوں، کاغذوں اور اس کے دوستوں کے کپڑوں اور جسموں کی بو اترنے لگی تھی۔ ایک نگران نے اس کو سیدھا کیا تو وہ ہال کی چھت کو گھورتے ہوئے بولا، میں ہال سے باہر نہیں جاؤں گا، نگران اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے اپنے ساتھی کو بلایا اِدھر آؤ، اور پھر بے حسی سے اعلان کرتے ہوئے بولا یہ لڑکا تو دنیا کے تمام امتحانات سے آج ہی فارغ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

فرنگن

عمران شاہد

ہمارا چھوٹا سا گاؤں شہر سے کچھ زیادہ دور واقع نہیں تھا، بل کہ اب تو شہر کی آبادی بے ہنگم انداز میں بڑھتے بڑھتے ہمارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی تھی۔ نانا ابو اکثر ہنستے ہوئے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ہمارا گاؤں بھی شہر کا ایک محلہ یا کچی آبادی بن جائے گا۔ ہمارا گھر چونکہ ہمارے ننھیال کے گھر کے قریب ہی تھا، اس لیے مجھے وہاں بڑا مزہ آتا تھا۔ میرے ابا فوج میں تھے اور جب وہ سن اے، کی جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، تو ہمارے نانا ابو نے ہمیں اپنے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا گھر لے کر دیا تھا، تب سے میں، امی اور انجم باجی گاؤں ہی میں رہ رہے تھے۔ امی گاؤں کے پرائمری سکول میں استانی لگ گئی تھیں جہاں انجم باجی بھی پڑھا کرتی تھیں، یوں زندگی کا پہیہ چلنے لگا تھا۔

مجھے گاؤں کا ہر موسم اچھا لگتا تھا۔ گرمیاں آتیں تو آس پاس کی کچی گلیاں دھول سے اٹ جاتیں۔ برسات کے دنوں میں گاؤں کی گلیاں کیچڑ بھری نہروں میں بدل جاتیں، اور جاڑے میں ان پر کہرا جم جاتا تھا۔ لیکن ان گلی کوچوں کی یادداشت پر کوئی موسم اثر انداز نہ ہوتا۔ وہ اپنے بے جان سینے پر پڑنے والی ہر چاپ کو اچھی طرح یاد رکھتی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، گاؤں کے کچے

آنگنوں سے اٹھنے والی ہر آہ، ہر مسکان اور ہر وہ نظر جو جس نیت سے کہیں بھی ڈالی گئی ہو، وہ سب کچھ ان گلیوں کی بے انت یادداشت میں مکمل طور پر محفوظ تھا۔

میں جب بھی اپنے آبائی گاؤں کی ان ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں قدم رکھتا ہوں تو کتنی خوبصورت یادیں میرے ساتھ چلنے لگتی ہیں۔ یادوں کے اس خزانے میں کئی آوازیں، کئی باتیں اور کئی چہرے شامل تھے مگر ایک چہرہ ایسا تھا جو ہمیشہ میرے ساتھ سفر کرتا، ایک ایسی ناقابلِ فراموش مورت جو میری آنکھوں سے کبھی محو نہیں ہوئی تھی۔ دودھیا سفید رنگ، جیسے موسمِ سرما کی روپہلی صبح کا اجالا، ہلکے سنہرے بال جو سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں تانبے کی تاروں کی طرح چمکتے تھے جو شام ڈھلے سرخی مائل ہو جاتے تھے۔ اور کانچ کے ٹکڑوں کی مانند سبز مائل شفاف آنکھیں، جن میں دیکھنے والے کو اپنا عکس نظر آئے۔ گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں نے اس کا جادوئی رنگ روپ دیکھ کر نہ جانے اس کا نام فرنگن کیوں رکھ دیا تھا۔ اس کے بچپن کے زمانے ہی سے جب پڑوس کی عورتیں اسے دیکھتیں تو آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے کہتیں،

”ہائے۔۔۔ اس کے رنگ روپ تو دیکھو ذرا، لگتا ہے ولایت سے کوئی میم آئی ہے، پکی فرنگن لگتی ہے۔“ تو بس وہ فرنگن ہو گئی۔ یہ نام اس کے ساتھ ایسا چپکا کہ وہ فرنگن کے نام سے ہی پکاری جانے لگی اور گاؤں کے لوگوں کو اس کا اصل نام یاد ہی نہ رہا۔ تو شاید نام صرف کاغذوں میں رہا۔ باقی ہر جگہ وہ فرنگن ہی کہلاتی رہی۔

وہ مجھ سے آٹھ دس برس بڑی تھی۔ اس کا باپ دین محمد ایک سیدھا سادہ زمیندار بندہ تھا۔ ہم سب اسے دینو چاچا کہتے تھے۔ ہمارے دور پار کے رشتہ دار بھی تھے لیکن اب آنا جانا کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ صبح نور کے تڑکے اٹھ کر کھیتوں کی راہ لیتا اور عصر کے بعد تک بیلوں کی جوڑی کے ساتھ کام میں جتا رہتا، شام کو گھر لوٹ آتا، مغرب کی نماز پڑھ کر اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اس کی زندگی میں کوئی پریشانی نہیں تھی سوائے اس کے کہ جب وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی گہری سبز آنکھیں دیکھتا تو فکرمندی سے کہتا:

”ایسی آنکھوں والیاں یا تو خوش نصیب ہوتی ہیں یا۔۔۔ سوہنا رب ہماری بچی کا وارث ہو۔“

تب تک میں نے فرنگن کا صرف نام ہی سنا تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ عاشورہ کے جلوس میں دھکم پیل کی وجہ سے میں امی سے جدا ہو کر انھیں سیاہ برقعوں کے ہجوم میں ادھر ادھر ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک سیاہ شال اوڑھے ایک گورے چٹے چہرے والی لمبی سی لڑکی میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی

”تم سعدی کے بھانجے ہو ناں؟“ اس کی سفید رنگت، زمردیں آنکھیں اور سنہرے بال دیکھ کر میں مرعوب ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا اور وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اسی دوران

امی مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں اور فرنگن انھیں سلام کرکے تیزی سے کالے برقعوں میں کہیں گم ہوگئی۔ تب میری عمر شاید سات آٹھ برس تھی اور فرنگن کا گھر ہماری گلی سے ایک دو گلیاں چھوڑ کر ایک کوچے میں تھا جو گاؤں کے بازار کی طرف نکلتا تھا۔ ایک روز میں مولوی صاحب سے سپارہ پڑھ کر واپس گھر آرہا تھا۔ امی نے مجھے پیسے دیئے تھے کہ عصر کی نماز کے بعد مسجد سے واپسی پر کریانہ کی دکان سے لال مرچیں لیتے آنا۔ میں نوٹ مٹھی میں دبائے، اپنی چارسدہ والی نئی چپل کی چرچراہٹ سے محظوظ ہوتا ہوا مرچیں لینے جا رہا تھا، کہ اچانک پیچھے سے ایک تیز نسوانی آواز آئی:

"اوئے ادھر آ، ذرا بات سن۔"

میرے قدم اسی جگہ پر رک گئے، میں نے مڑ کر دیکھا۔ فرنگن اپنے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی مسکرا رہی تھی، دوپٹہ لاپرواہی سے کندھے سے جھول رہا تھا، سنہرے بالوں کی گندھی ہوئی چوٹی سامنے لٹک رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ دبائے، مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر نروس سا ہوگیا۔

"ڈر گیا؟ آجا میرے پاس۔ ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔"

میں نے سوچا کہ دوڑ کر تنگ گلی سے نکل جاؤں لیکن وہ میرا ارادہ بھانپ کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی اور مجھے دبوچ لیا۔

"ارے چھوڑو مجھے۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

وہ زور سے ہنسی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے تھے مگر گرفت مضبوط تھی۔ اس نے میرا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لیا، نیچے جھکی اور میری آنکھوں پر بوسے دینے لگی۔ میں اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کرتا رہا، وہ ہنستی رہی، اور چٹاچٹ میری بلائیں لیتی رہی۔ میری دھڑکن بہت تیز ہوگئی۔ مجھے لگا جیسے چند منٹوں کے لیے وہ تنگ سی نیم تاریک گلی باقی دنیا سے کٹ کر کسی اور ٹائم زون میں چلی گئی ہے جہاں صرف ایک نروس بچہ اور ایک نٹ کھٹ ٹین ایجر الہڑ لڑکی کے سوا کوئی نہ ہو۔

"بس کرو نا باجی۔" میں نے روہانسا ہو کر کہا۔

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ وہ سیدھی ہوئی اور اپنا دوپٹہ درست کیا۔ پھر آہستہ سے جھک کر میرے کانوں میں دھیرے سے بولی:

"اپنے سعدی ماموں کو میرا سلام کہنا۔ مگر یہ مت بتانا کہ میں نے سلام بھیجا ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "آپ کا نام نہ بتاؤں تو سلام کیسے کہوں؟"

"چھوٹے بچے اتنے سوال نہیں پوچھا کرتے۔ چل اب جا۔" اس نے میری چپٹی سی ناک کو اپنی انگلی اور انگوٹھے میں شرارت سے دبا کر کہا۔ میں نے زمین پہ گرا اپنا نوٹ اٹھایا اور مٹھی میں دبائے وہاں سے بھاگ اٹھا۔ گھر پہنچ کر میں نے امی کو مرچوں کا پیکٹ تھماتے ہوئے شکایت کی:

"امی، آج فرنگن نے مجھے مسجد والے کوچے میں پکڑ لیا تھا۔"

اس وقت پڑوس کی ثوبیہ آپی بھی اپنے گھر کی

دیوار سے جھانکتے ہوئے امی سے باتیں کر رہی تھی، وہ ہمہ وقت ہمارے ہی گھر کی ہر بات کی ٹوہ میں رہتی تھیں۔
امی نے مرچیں ڈبے میں ڈالیں اور دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر مسکراتے ہوئے بولیں:
"اچھا؟ کیا کہہ رہی تھی وہ؟"
"امی وہ مجھے بہت بری لگتی ہے۔ اس نے زبردستی میری آنکھوں کو چوما اور---"
"اور کیا؟" امی نے استفسار کیا۔
"اس نے سعدی ماموں کو سلام بھیجا ہے۔" میں نے معصومانہ انداز میں کہا۔ امی کی مسکراہٹ یک دم سنجیدگی میں بدل گئی لیکن انھوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ نانی اماں صحن میں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو سویٹر بنتے ان کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں انجانی سی فکر لہرا رہی تھی۔
"جا بیٹا، باہر جا کر کھیلو۔" نانی اماں نے آہستہ سے کہا اور پھر سر جھکا کر تیزی سے سلائیاں چلانے لگیں۔
میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر ثوبیہ آپی غصے سے دانت پیستی ہوئی دیوار کے ساتھ رکھی چارپائی سے چھلانگ لگا کر اتر گئیں۔ مجھے یہ بات سمجھ نہ آسکی کہ ثوبیہ آپی کو کس بات سے تکلیف ہوئی تھی۔ یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ وہ سعدی ماموں کو پسند کرتی تھی۔ اس کی ماں نے کئی بار اشاروں کنایوں میں نانی اور امی سے اس کے رشتے کی بات بھی کی تھی۔ لیکن یسی آنٹی کی مخالفت کی وجہ سے کسی نے ان کی تجویز پر توجہ نہ دی۔ یسی آنٹی جو ماموں سعدی سے بڑی تھیں اور اپنی تینوں بڑی بہنوں کی شادی کے بعد ماں باپ کی خدمت کے لیے شادی سے انکار کر کے گھر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بعد میں شہر کے زنانہ کالج میں اردو کی لیکچرار بن گئیں۔
نانا ابو کی طویل علالت اور قبل از وقت ریٹائرمنٹ نے انھیں اب گھر کا کرتا دھرتا بنا دیا تھا۔ گھر کے ہر فیصلے میں ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ثوبیہ آپی نے اس ناکامی کا سارا غصہ فرنگن سے نفرت کا اظہار کر کے نکالا، جسے وہ ہمیشہ اپنا رقیب گردانتی رہیں اور اسے جاہل گنوار، اَن پڑھ دیہاتن جیسے ناموں سے پکارا کرتیں۔ مجھے اکثر اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی تھی۔
یسی آنٹی نے جب سے کالج میں پڑھانا شروع کیا تھا تب سے ان کے انداز و اطوار میں بڑا فرق آگیا تھا۔ یہ لیکچرار کی نوکری ان کے لیے ایک نئی پہچان ثابت ہوئی تھی اور گاؤں والوں نے انھیں پروفیسر صاحبہ کا لقب دے دیا تھا۔ گاؤں کی سبھی عورتیں گھروں میں قید رہتیں مگر یسی آنٹی پورے اعتماد کے ساتھ معاشرے میں اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ وہ روزانہ صبح اچھے معیار کا استری شدہ جوڑا پہنے، کشیدہ کاری والی شال سر پر دھرے، کالج کے لیے نکلتیں۔ بالوں کی موٹی چوٹی کمر تک آتی تھی، جو کہ اب سفید ہونے لگی تھی لیکن وہ خضاب نہیں لگاتی تھیں، کہتی تھیں کہ سفید بالوں سے شخصیت میں ایک وقار سا آجاتا ہے۔ ہاتھ میں ایک آدھ کتاب، ایک خوب

صورت جلد والی ڈائری اور کاندھے پہ جھولتا ہوا پرس ہوتا۔ گاؤں کی عورتیں دروازوں کی اوٹ سے انھیں پُروقار انداز میں چلتا دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ تاہم سیمی آنٹی کے نزدیک دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی:

"ڈھنگ" کے لوگ اور باقی سب۔

ڈھنگ کے لوگ وہ تھے جن کے گھر پکے تھے، جو اردو بولتے تھے، جن کا کوئی سرکاری عہدہ تھا یا علاقے میں کوئی شناخت تھی۔ "باقی سب" میں ثوبیہ آپی، فرقان اور ان جیسے دیگر عام لوگ آتے تھے جو کھیتوں میں کام کرتے، دھوتیاں باندھتے، جن کی لڑکیاں بے پردہ گلیوں میں گھومتی پھرتیں یا چھتوں اور دیواروں سے جھانک کر پڑوسیوں کے گھروں کی ٹوہ لیتیں۔ اکثر سیمی آنٹی ہاتھ نچا کر کہتیں: "ان میں اور ہم میں کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔"

اس سے ان کے چہرے پہ تو دولتیوں جیسی نخوت اور غرور کے رنگ جھلک رہے ہوتے۔ نانا ابو سمیت گھر کے افراد میں کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ انھیں بتاتا کہ چند دہائیاں قبل ہمارا اپنا خاندان بھی ان پڑھ اور دھوتیاں باندھ کر کھیتوں میں بیلوں کو ہانکتا، ہل چلا کر بال بچوں کے لیے رزق حلال کمایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ سعدی ماموں بھی ان کی باتوں پر خاموش ہو جایا کرتے، انھوں نے کبھی سیمی آنٹی سے بحث نہیں کی تھی۔ بل کہ سعدی ماموں کو میں نے گھر کے

معاملات میں ہمیشہ خاموش ہی پایا تھا۔ وہ چار بہنوں کے اکلوتے اور لاڈلے بھائی تھے۔ لانبا قد، اکہرا بدن، کھلتی ہوئی سپیدی مائل رنگت، سنہ ۸۰ء کی دہائی کے فیشن کے مطابق تراشی ہوئی خوب صورت مونچھیں اور بال بھی اسی عہد کے فلمی انداز میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت کا سب سے پرکشش حصہ ان کی بڑی بڑی، گہری، بھوری، سوچتی آنکھیں جن میں دیکھنے والا اپنے خواب بھی ڈبو بیٹھے۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جب بولتے تو ان کی گہری اور متاثر کن مردانہ آواز دل میں گھر کر جاتی۔ وہ اگرچہ سکول سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے جس میں ان کی نالائقی سے بڑھ کر اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے بے جا لاڈ پیار کا زیادہ ہاتھ تھا۔ وہ بھی دیگر زمینداروں کے بیٹوں کی طرح بس اچھی زندگی گزارنے کو ہی مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔ ملازمت یا کاروبار کا تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ زمینوں سے اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ تاہم وہ ایک سنجیدہ انسان تھے۔ ان کی ایک عجیب سی عادت تھی کہ بات کرتے ہوئے زمین کو تکتے رہتے تھے، جیسے کچھ کھویا ہوا تلاش کر رہے ہوں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے اور ان کی موجودگی میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی مجھے ڈانٹ ڈپٹ سکے۔ سب مجھے ماموں کا لاڈلا کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔

ایک روز میں اور سعدی ماموں آنگن میں

بچھی چارپائیوں پر براجمان تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ دھوپ سینکنے کے لیے تین چارپائیاں آڑی ترچھی پڑی تھیں اور بیچ میں ایک لکڑی کی میز جو چائے، قہوے کی پیالیاں اور چینک رکھنے کے کام آتی۔ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے سعدی ماموں اخبار ہاتھ میں پکڑے بے دھیانی سے صفحے الٹ پلٹ رہے تھے۔ ان کے انداز میں بے چینی جھلک رہی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا:

''ماموں، کسی نے آپ کو سلام کہا ہے۔''

ماموں کے بیقرار ہاتھ اچانک رک سے گئے۔ البتہ اخبار اسی طرح انگلیوں میں تھامے رہے۔ جیسے کسی چلتی گھڑی کی سوئیاں سیل ختم ہونے کے بعد رک گئی ہوں۔ پھر دھیرے سے بولے:

''کس نے؟'' انھوں نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

''فرنگن نے۔ اس نے کہا تھا کہ سعدی ماموں کو میرا سلام کہنا۔''

ماموں کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا اور انھوں نے تجسس سے پوچھا ''اور کوئی بات کہی اس نے؟''

''جی۔ اس نے کہا تھا کہ اپنے ماموں کو میرا نام مت بتانا۔ بس یہی کہنا کہ ایک دوست نے سلام بھیجا ہے، تمھارے ماموں خود ہی سمجھ جائیں گے۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری مگر پھر وہ اخبار ایک طرف رکھ کر خاموشی سے اٹھے اور بغیر کچھ کہے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کے کمرے سے منصور ملنگی کی مدھر آواز میں سرائیکی لوک گیت گونجنے لگا:

''ہک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنئے!''

میں نے اکثر محسوس کیا تھا کہ نیمی آنٹی دانستہ طور پر سعدی ماموں کے سامنے فرنگن کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کرتی تھیں۔ وقت بے وقت اس کی غیبت میں مصروف رہتیں۔ وہ فرنگن کا نام لیے بغیر کہا کرتی تھیں:

''عورت کی بھلی صورت کا کیا کرنا جب اس کی زبان گز بھر کی ہو؟ سارا دن گلیوں میں لونڈوں کی طرح کدکڑے لگاتی پھرتی ہو۔ جب کوئی تربیت کرنے والا نہ ہو تو جاہل لوگوں کی اولاد ایسے ہی خود رو پودوں کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ذرا دیکھو تو، چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔''

سعدی ماموں آنٹی کی ایسی باتیں سن کر اداس ہو جایا کرتے مگر کہتے کچھ نہیں تھے۔ لیکن ماموں کے دل کا حال مجھ سے زیادہ عرصہ چھپا نہ رہ سکا۔ وہ اپنے کمرے میں احمد فراز اور پروین شاکر کا کلام پڑھتے اور ساتھ ساتھ کشور کمار، منصور ملنگی، عطا اللہ عیسیٰ خیلوی اور نہ جانے کیسی کیسی کیسٹوں کا ڈھیر بھی بڑھتا گیا۔

موسم خزاں کی ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ ہوا میں سرسوں کے پھولوں کی باس پھیلی تھی۔

فرنگن اپنی چھت پر کھڑی کپڑے الگنی پر لٹکا رہی تھی، اس کے سنہرے بال ڈھلتی دھوپ میں سونے کی تاروں کی مانند چمک رہے تھے۔ عین اسی وقت سعدی ماموں گلی سے گذر رہے تھے کہ انھوں نے چلتے چلتے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا۔ میں اس وقت بائیسکل کے پیڈل مارتا بیبی آنٹی کا پسندیدہ اچار لینے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اتفاق سے یہ سارا منظر دیکھ لیا۔ شام کی اذان کے ساتھ ہی ہمارے گاؤں کے علاوہ شہر کے بازار کی زیادہ تر دکانیں بھی بند ہو جایا کرتی تھیں۔ میں جیسے ہی فرنگن کے گھر کے نزدیک پہنچا، عین اسی لمحے فرنگن نے نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ ماموں نے ادھ پیا سگریٹ نزدیکی بدرو میں پھینکا اور ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں نے بریک لگا کر بائیسکل گلی کی ایک طرف روک دی۔ فرنگن بھی اسی ایک منقسم لمحے میں مقید ہو کر رہ گئی۔ ایک پل ایک صدی کی مانند گزرا۔ نہ کوئی بولا، نہ ہلا۔ دونوں جیسے کسی نادیدہ دھاگے سے بندھ گئے ہوں جسے توڑنے کی کسی میں نہ ہمت ہو نہ چاہ۔ اس نے اپنا سنہرا سر جھکایا، داہنا ہاتھ سلام کے انداز میں پیشانی سے مس کیا اور اپنے گلے میں جھولتی اوڑھنی کو کسی بڑی عمر کی عورت کی طرح سر پہ رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔ میں یہ سب ماجرا اپنی بائیسکل پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ میری عمر اس وقت کوئی بارہ تیرہ برس تھی۔ میں پوری طرح بات سمجھ نہیں سکا تھا مگر ایک لطیف سا احساس میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں بڑا ہو گیا۔ جب میں ہائی سکول میں پہنچا تو فرنگن بھی بدل گئی تھی۔ شکل وصورت وہی تھی، وہی آنکھیں، وہی سنہرے بال، وہی تیکھے نقش۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں وہ لڑکپن والی شرارت نہیں رہی تھی۔ اب ایک اور جذبہ تھا جسے اب میں بآسانی پہچان سکتا تھا۔ ایک تھکاوٹ تھی اس کی نگاہوں میں، شاید انتظار کی تھکاوٹ، جو اس وقت دل سے آنکھوں میں در آتی ہے جب انسان کسی بات کا برسوں انتظار کرے اور انتظار کی کوئی حد نہ آئے، بس انتظار بڑھتا ہی رہے۔

ایک دن اس نے مجھے پھر روکا۔ اب وہ میری آنکھوں پر بوسے نہیں دیتی تھی۔ بس مجھے گلی میں روکتی تھی، بغیر مقصد کے کھڑی رہتی تھی اور سعدی ماموں کی باتیں کرتی جاتی تھی، جیسے اپنی ان کہی بات کو دوسروں کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچانا چاہتی ہو۔

''سعدی کہاں ہے آج کل؟'' اس نے پوچھا۔

''گھر میں ہوں گے۔''

''گھر میں۔'' اس نے دہرایا۔ ایک لمحہ خاموش رہی پھر بولی، ''کبھی باہر بھی نکلتا ہے یا بیبی باجی نے قید کر رکھا ہے؟''

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے میری آنکھوں میں گہری نظر سے دیکھا۔ میں بچپن کی طرح ایک بار پھر گھبرانے لگا کہ کہیں وہ ماضی

کی طرح بے قابو ہو کر میری آنکھوں پہ بوسے نہ دینے لگ جائے۔ لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی، بلکہ کہنے لگی:

"تمہاری آنکھیں بالکل سعدی جیسی ہیں۔ رنگ بھی، شکل بھی۔" اس نے میری آنکھوں کو ہاتھوں سے ہلکا سا چھوا۔

"اسے کہنا۔ کوئی آج بھی چھت پہ اس کا منتظر رہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں وہیں گومگو کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ اس جملے میں چھپا کرب مجھے اس وقت سمجھ نہ آ سکا، لیکن برسوں بعد جب میں سمجھنے کے قابل ہوا، تو بے ارادہ میری آنکھیں بھر آئیں۔

پھر ہمارے چھوٹے سے گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ فرنگن کی شادی کہیں طے ہو گئی۔ ایک دور کے رشتہ دار کا لڑکا تھا، شہر میں کوئی کاروبار کرتا تھا۔ دینو چاچا نے سوچا کہ بیٹی کی زندگی سنور جائے گی۔ کسی نے فرنگن سے نہیں پوچھا۔ اس زمانے میں لڑکیوں سے رشتے طے کرتے وقت کون پوچھتا تھا؟ یہ کوئی نہیں جان سکا کہ اس رات وہ کب تک جاگی، کتنا روئی، کتنی دیر چھت پہ لیٹی بھیگی پلکوں سے تاروں کو تکتی رہی۔ لیکن اگلی صبح جو ہوا وہ سب کو پتہ چل گیا۔ دینو چاچا کے گھر سے دل دہلا دینے والی چیخیں اٹھیں اور گاؤں بھر کے ماحول کو اداس کر گئیں۔ فرنگن نے نیلا تھوتھا چاٹ لیا تھا۔ گاؤں میں افراتفری مچ گئی۔ عورتیں بھاگتی ہوئی آئیں۔ دینو اپنے صحن میں گھٹنے ٹیکے بے بس بیٹھا رو رہا تھا، اس کے ضعیف ہاتھ کانپ رہے تھے۔ حکیم آیا، لیکن بات نہ بنی۔ پھر کسی نے شہر سے ڈاکٹر بلوا لیا۔ علاج ہوا اور وہ خوش قسمتی سے بچ گئی۔ سب نے شکر ادا کیا۔ جب وہ ہوش میں آئی اور اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوئی تو اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گاؤں کی گلی وہی تھی، وہی دھوپ تھی، وہی پرندے تھے۔ دنیا میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بس وہ بدل گئی تھی۔ اس کا اندر کوئی ایسا حصہ مر گیا تھا کہ پھر تمام عمر اسے کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

تین چار دن بعد دینو اپنے چاچا دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لے کر نانا ابو کے مہمان خانے کے دروازے پر آیا اور دستک دی۔ نانا ابو اس وقت نماز سے فارغ ہو کر تسبیح ہاتھ میں لیے صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے باہر جا کے دیکھا تو دینو اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی کھڑے تھے۔ نانا ابو نے انھیں اندر بلا لیا۔ دینو آگے بڑھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی، آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں، تین راتوں کا جاگا ہوا مغموم چہرہ تھا۔ اس نے کوئی لمبی بات نہیں کی۔ بس اپنی پگڑی سر سے اتار کر نانا ابو کی گود میں رکھ دی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کے دونوں بھائیوں نے بھی اپنی پگڑیاں اتاریں۔ تین سیاہ پگڑیاں نانا ابو کی جھولی میں پڑی تھیں اور تین سفید سر نانا کے آگے جھکے ہوئے تھے۔

گاؤں کی گلی خاموش تھی۔ نانا ابو اس عجیب و غریب منظر میں گھرے خاموش بیٹھے تھے، وہ کچھ دیر تک کچھ نہیں بولے ۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

”اٹھاؤ اپنی پگڑیاں دین محمد۔ کوئی باپ اپنی دھی رانی کی خوشی مانگنے آئے تو ہم انکار نہیں کیا کرتے۔ آج سے یہ رشتہ پکا سمجھو“ وہ اٹھ کر دینو سے گلے ملنے ہی لگے تھے کہ یک دم سے سیمی آنٹی بڑی چادر اوڑھے مہمان خانے کے اندر آ گئیں۔ وہ جانے کب سے دروازے کی آڑ میں کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھیں۔ ان کا چہرہ ایک چٹان کی طرح سخت اور بے تاثر تھا۔ ان کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ ایسے آ کر کھڑی ہو گئیں جیسے کوئی جیلر کسی کو پھانسی چڑھانے آیا ہو۔ انھوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا:

”ابا جان آپ نے یہ کیسا وعدہ کر لیا؟“

نانا نے انھیں گھور کر دیکھا اور کہا:

"ہاں، میں نے وعدہ کر لیا۔ ایک بے بس باپ اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر ہمارے گھر چل کے آیا ہے۔ میں اس کا مان کیسے توڑ سکتا ہوں؟"

”ابا جان“ آنٹی کی آواز مزید سخت ہو گئی۔

”آپ کو معلوم ہے میں کالج میں ایک لیکچرار ہوں، سارا گاؤں مجھے پروفیسر صاحبہ کہتا ہے۔ میں نے اتنی محنت سے اپنا مقام بنایا ہے، اپنی اور خاندان کی عزت بنائی۔ ٹیچر برادری میں میری ایک پہچان ہے، کل کو میرے رفقائے کار ہمارے گھر آئیں گے، خوشی غمی میں شریک ہوں گے۔ کوئی پوچھے گا کہ یہ کون لوگ ہیں تو میں کیا جواب دوں گی؟ یہ دھوتی باندھنے والے جاہل گنوار لوگ جو کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں، ان کی لڑکی نے بیوقوفوں کی طرح اپنی جان دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟ ایسے لوگوں سے ہمارا کیسے ناطہ ہو سکتا ہے؟“

سیمی آنٹی کرخت لہجے میں بولتی چلی گئیں۔

”لیکن میں زبان دے چکا ہوں بیٹی ۔“ نانا نے پروفیسر صاحبہ کے سامنے کمزور لہجے میں کہا۔

”تو پھر آپ کو دو میں سے ایک بیٹی کا انتخاب کرنا پڑے گا، فرگن یا میں؟“ انھوں نے چیخ کر کہا اور نانا ابو نے سر جھکا لیا۔ دینو اور اس کے بھائی یہ سب خاموشی سے سنتے رہے، ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اٹھے، اپنی پگڑیاں اٹھائیں اور خاموشی سے چلے گئے۔ وہ خاموشی آج تک اس دروازے کی ڈیوڑھی میں گونجتی ہے۔ نانا ابو نے سیمی آنٹی کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور ایک گہرا کرب بھی۔

”تو نے آج ایک باپ کا مان توڑ دیا بیٹی“ انھوں نے دکھی لہجے میں کہا مگر سیمی آنٹی سنی اَن سنی کرتی وہاں سے چلی گئی۔

سیمی آنٹی کی جلد بازی کی بدولت سعدی

ماموں کی شادی شہر کی ایک لڑکی سے طے ہو گئی۔ وہ لڑکی خوبصورت تھی، پڑھی لکھی تھی، اردو بھی اچھی بولتی تھی۔ وہ سعدی ماموں جیسے ہینڈسم مرد کو پا کر بہت خوش تھی۔ لیکن گاؤں کا ماحول اسے راس نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ کمرے میں بند رہتیں، باہر نکلتیں تو منہ بنائے رکھتیں، گاؤں کی عورتوں سے بھی زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھیں۔ سعدی ماموں سے بھی اس کا رویہ خراب تھا اور وہ اکثر شہر شفٹ ہونے کی بات کرتی۔ گھریلو ناچاقی بڑھتی گئی۔ ماموں نے رات دیر سے گھر آنا شروع کر دیا۔ اس سے جھگڑے مزید بڑھ گئے۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں سعدی ماموں نے چپ چاپ نشے کی گھاٹیوں میں پناہ لے لی۔ پہلے پہل تو وہ چھپ کر پیتے تھے، پھر سب کے سامنے پینے لگے۔ گھر والوں نے برا بھلا کہا، سب نے روکا، منع کیا مگر سعدی ماموں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے۔ گاؤں کے لوگ کہنے لگے: سعدی برباد ہو گیا۔''

ایک رات میں نے انھیں آنگن میں اکیلے بیٹھا دیکھا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز تھے، سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''ماموں؟''

انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں لیکن آنسو نہیں تھے، نہ جانے وہ کب کے سوکھ چکے تھے۔

''جا بھانجے سو جا۔'' انھوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے معصومیت سے پوچھا ''آپ کیوں نہیں سوتے ماموں؟''

وہ لمحہ بھر خاموش رہے اور پھر بولے، ''نیند بھی قسمت والوں کو آتی ہے بھانجے۔'' ان کی آواز میں ایسی تھکاوٹ تھی جو سات جنم بھی نہیں جاتی۔

''ماموں جان۔ آپ کیوں اداس رہتے ہیں؟''

انھوں نے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر کچھ آیا، کوئی درد، کوئی پرانی یاد۔

''جا۔'' انھوں نے آہستہ کہا، ''بچوں کو بڑوں کے غم نہیں سمجھنے چاہئیں۔''

میں اٹھ کر چلا آیا۔ پھر ان کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ موٹی موٹی بھوری آنکھوں والی، بالکل ماموں جیسی۔ بچی کو جنم دے کے ممانی اچانک چل بسیں۔ ڈاکٹروں نے کہا دل کمزور تھا۔ گاؤں والوں نے کہا گاؤں راس نہیں آیا۔ سچ کیا تھا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ ادھر فرزانہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ ایک اجنبی سے بیاہ کر گاؤں سے رخصت ہو گئی۔ یہ سعدی ماموں کے لیے دوسرا بڑا حادثہ ثابت ہوا اور اس کے بعد سعدی ماموں کو کبھی کسی نے بات چیت کرتے نہیں دیکھا، بس انھیں ایک پکی چپ لگ گئی تھی۔ یہ غم ان کے لیے اتنا بڑا ثابت ہوا کہ دھان پان سے سعدی ماموں ایک رات

سوئے تو پھر نہ اٹھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھیں کوئی بڑی بیماری نہیں تھی۔ بس آہستہ آہستہ اندر ہی اندر گھلتے گئے، جیسے کچی دیوار بارش میں گھلتی رہتی ہے۔ میرے لیے گاؤں میں دلچسپی ختم ہو گئی، رونقیں روٹھ گئیں اور میں نے وکالت میں داخلہ لے کر گاؤں چھوڑ دیا۔ باجی بیاہ کر اپنے پیا دیس کراچی سدھار گئی تھیں، میں اپنی وکالت میں مصروف ہو گیا اور امی ریٹائر ہو کر میرے ساتھ شہر آ گئیں۔ مگر گاؤں میرے اندر سے کبھی نہ نکل سکا۔

کچھ دنوں سے مجھے اپنے گاؤں کی بڑی یاد آ رہی تھی۔ ایک روز میں چپ چاپ گاؤں کی طرف نکل پڑا۔ وہی کھیت کھلیان، وہی کچی گلیاں میرے سامنے تھیں۔ میں اُسی کوچے کی طرف جا نکلا جہاں فرنگن نے کبھی مجھے پکڑ کر میرے بوسے لیے تھے۔ کوچے میں قدم رکھتے ہی کتنی ہی یادیں جاگ کر میرے بے قرار قدموں سے لپٹ گئیں۔ سعدی ماموں، فرنگن اور ان کی خوبصورت یادیں میرے سامنے بچھتی چلی گئیں۔

اچانک ایک چھوٹا سا بچہ کھیلتا ہوا میرے سامنے آ گیا جس کی کانچ جیسی سبز آنکھیں، سنہرے بال اور دودھیا رنگت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

”سعدی کہاں جا رہا ہے؟ ادھر آ۔“ اچانک کسی کی آواز گونجی اور میری نظریں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں، سامنے دیکھا تو دروازے پر فرنگن کھڑی تھی جو بچے کو آوازیں دے رہی تھی۔ برسوں بعد فرنگن کو دیکھ کر میں ایک بت بن کر رہ گیا۔ فرنگن نے شاید مجھے پہچانا نہیں تھا، اس لیے وہ مجھے دیکھ کر اندر ہی جانے لگی تھی کہ اچانک میرے منہ سے ”فرنگن“ نکل گیا اور وہ وہیں ٹھٹھک کر رک گئی۔ مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرنگن میرے سامنے کھڑی تھی۔ سبز آنکھوں والا بچہ واپس پلٹ آیا تھا، میں اُسے دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا جس کا نام سعدی تھا۔

”میں ساغر ہوں، پہچانا؟“ میں نے گنگ کھڑی فرنگن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یک دم سے اس کی آنکھوں میں کئی رنگ اتر آئے اور چہرہ جیسے تازہ گلاب کی مانند کھل اٹھا۔

”تم ساغر ہو؟ بخدا میں تو پہچان ہی نہ سکی۔“ فرنگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُس نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھائی اور میرے سامنے والی چارپائی پر آ کے بیٹھ گئی۔ بالوں میں چند سفید تار آ گئے تھے لیکن آنکھیں وہی تھیں، وہی گہری سبز جھیل جیسی آنکھیں۔ آنگن میں ایک پرانا کیکر کا درخت تھا جس کی چھاؤں دیوار پر پڑ رہی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر تک یوں ہی خاموشی سے دم سادھے بیٹھے رہے، جیسے ایک دوسرے کی یادیں ٹٹول رہے ہوں۔ گاؤں کی دوپہر تھی، درخت کی شاخوں سے چڑیاں بول رہی تھیں۔ ننھا سعدی صحن میں

اپنی سائیکل چلانے لگا۔ فرنگن جو خاموشی سے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا، ایک پرانے گھاؤ سے لہو پھوٹنے لگا، جیسے جاگتی آنکھوں سے دیکھا گیا کوئی خواب جو پورا نہ ہوا ہو۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''جانتے ہو ساغر، جب تم چھوٹے تھے اور میں تمھاری آنکھوں پر بوسے دیا کرتی تھی تو سب کہتے تھے یہ پاگل ہے۔''

''ہاں، میں بھی یہی سمجھتا تھا۔'' میں نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

میں واقعی تمھارے ماموں کی محبت میں دیوانی تھی۔''

وہ مسکرائی۔ اس زخمی سی مسکراہٹ میں ایک گہرا درد پنہاں تھا اور طمانیت کی عجیب سی آمیزش بھی جسے وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے سب کچھ کھو کر زندگی سے صلح کر لی ہو۔

''تمہاری آنکھوں میں مجھے سعدی نظر آتا تھا۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی سب کچھ۔ میں تمھارے ذریعے اس کی آنکھوں کو بوسے دیتی تھی۔''

میری آنکھوں میں جیسے کانٹے اگ آئے ہوں۔ چائے کا گھونٹ نگل نہ سکا، حلق میں جیسے کلیجہ کٹ کر آن پھنسا ہو۔ میں نے چائے کی پیالی دونوں ہاتھوں میں تھام لی تاکہ آنکھوں کی نمی چھپا سکوں۔

''اور سلام؟'' میں نے آہستہ پوچھا۔

''وہ بھی۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔'' جو بات کہی نہ ہو اور وہ کہہ نہ سکو تو وہ سلام بن جاتی ہے نا؟''

''تم کیوں نہیں آئی سعدی ماموں کی میت پر؟ جانتی ہو گاؤں کی سب عورتیں تمھاری راہ دیکھتی رہیں کہ فرنگن ضرور آئے گی اپنے محبوب کا چہرہ آخری بار دیکھنے۔'' برسوں سے دبا سوال خود بخود میری زبان سے پھسل پڑا۔

''میں نہیں آنا چاہتی تھی، تم نہیں جانتے میری کیا حالت تھی، سعدی کی میت دیکھ کر میری جان نکل جاتی، میں آج بھی سعدی کو زندہ سمجھتی ہوں اور یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے دل کے اندر موجود ہے، اسی لیے میں نے بیٹے کا نام سعدی رکھا ہے۔'' وہ آہستہ بولی۔ فرنگن کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی جو بارش کے بعد دھوپ نکلنے پر ہوتی ہے، جب یہ پتہ نہیں چلتا کہ رونا ہے یا ہنسنا ہے۔ میں جب فرنگن کے گھر سے نکلا تو گاؤں کی وہی گلی تھی، وہی کچی، دھوپ میں پھٹی ہوئی، جانی پہچانی۔ لیکن میرے قدم بھاری تھے۔ گاؤں کی گلیاں آج بھی وہی کچی ہیں، بارش میں کیچڑ کی نہریں بن جاتی ہیں جو کہ دھوپ میں خشک ہو کر پھٹ جاتی ہیں۔ لیکن ان کی یادداشت بڑی پکی ہے۔ وہ سب کچھ یاد رکھتی ہیں۔ چہرے، قدموں کی چاپ، آنکھوں کے بوسے اور محبتیں، جو مکمل نہیں ہوتیں تو وقت انھیں اگلی نسل کو سونپ دیتا ہے۔ آج گاؤں کی انہی گلیوں میں ایک بار پھر سعدی جنم لے چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

کنوارا قافلہ

علی حسن اویسی

کچھ شہر عجب تاریخی حقائق کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں تو کچھ مکینوں کی عجیب عادت کے سبب۔ البتہ لاہور اس فہرست میں نہیں آتا۔ ہمارے دیہات میں لاہور کا نام دو صورتوں میں لیا جاتا ہے۔ گاؤں کے کسی لونڈے نے امتحانات میں قدرے معقول نمبر لیے نہیں کہ ”ایہنو لاہور گھلو“ کی آوازیں چاروں سمت سے آنے لگتی ہیں اور دوسری بار لاہور کا نام اس وقت آتا ہے جب ایمرجنسی وارڈ سے منحوس سا چہرہ لیے ڈاکٹر برآمد ہوتا ہے اور مریض کے ورثا سے کہتا ہے ”ایہنے نہیوں بچنا ایہنو لہور لے جاؤ“۔

ہماری جسمانی ساخت عین دوسری صورت پر پوری اترتی ہے مگر ہم لاہور پہلی وجہ سے بھیجے گئے۔ لاہور جا کر یہ راز کھلا کہ لاہور میں کالج اور چائے خانے برابر بڑھتے جا رہے ہیں البتہ اتنی تعلیم نہیں دی جاتی جتنی چائے۔ چائے کا ذکر ہو اور کوئٹہ چائے خانے کا ذکر نہ ہو تو بات بنتی نظر نہیں آتی۔ کوئٹہ کیفے کی شہرت بے روزگار شاعروں اور فضول موضوعات پر تحقیق کرنے والے محققین کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی خاص

بات نت نئے کاروبار کے منصوبے بنتا ہے۔ یہاں بننے والے منصوبے تو کبھی حقیقت نہیں بن پائے البتہ اس کینٹے کا کاروبار خوب چمکتا رہتا ہے۔

پچھلے دنوں کی بات ہے، ہم چار پانچ بے روزگار دوست، حسب معمول چائے خانے پر بیٹھے منصوبے گھڑ رہے تھے کہ اچانک زمین تھرتھرائی، کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا ایک دیوہیکل قسم کا دوست چلا آرہا ہے، آتے ہی کہنے لگا یار سامان باندھو، جنوبی پنجاب گھومنے چلتے ہیں۔ ایک قہقہہ پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ اِدھر اُدھر کی ہوائی باتیں ہوئیں، چائے کے کپ خالی ہوئے، اس سے پہلے کہ ہم ہاسٹل کو چلتے، وہی دوست کہنے لگا ”میں نے ٹکٹ بک کروا دیئے ہیں آج رات ساڑھے بارہ بجے کی ٹرین سے ہم ملتان جا رہے ہیں۔“ اور ٹکٹ ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ہم سب حیرت میں مبتلا، کاٹو تو لہو نہیں، شدید کنوارے لونڈے نے جو ٹکٹ کروائے تھے اس پر اس کا نام معہ ایک عدد بیوی اور دو عدد بچے درج تھا۔ بچے تو کہیں سے بھی درآمد کیے جا سکتے تھے مگر بیوی۔ حیرت میں دیکھ کر کہنے لگا، بچوں کا تم دیکھ لو البتہ بیوی تو جواد ہی بنے گا۔ ہاہا کار مچی۔ ہم قہقہے لگاتے جاتے تھے جبکہ جواد اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے درپے تھا۔ کچھ دیر یہی شور شرابہ رہا پھر ہم ہاسٹل کو بھاگے کہ سامان باندھیں کہیں گاڑی ہی نہ چھوٹ جائے۔

ہماری حالت کا اندازہ آپ پنجابی کی اس کہاوت سے لگا سکتے ہیں کہ ”بوہے آئی جنج، ونّھو کڑی دے کن“ عجلت میں ہم نے بھرے ہاسٹل کو لگائے تالے اور لگے رائڈرز تلاش کرنے، ایک رائڈر ملا تو کیا دیکھتے ہیں وہ ہم سے بھی دو چار ہاتھ آگے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ہم ریلوے سٹیشن سے ملتان کو روانہ ہوں گے، کہنے لگا ”بھئی ملتان نہ جانا ورنہ افریقیوں اور تم میں صرف ایک فرق رہ جائے گا، باقی محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔“ ریلوے سٹیشن پہنچے تو جواد کی ادبی روح جاگ اٹھی۔ ٹرین چلنے میں گھنٹہ بھر باقی تھا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جواد نے مغلیہ تاریخ کی تمام کتھا کہہ سنانے کے بعد ریل کی سیٹی اور ہجر کا کرب پر طویل لیکچر دے ڈالا۔ ہم ”ہوں ہوں“ کرتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے ”اگر اس کا یہی حال رہا تو یہ بے چارہ بھری جوانی میں پاگل ہو جائے گا“ خیر ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا اور وقار کو کچھ وعدے یاد آ گئے جو نبھائے نہ گئے تھے۔ کہنے لگا ”علی، تم نے بوتل کا کہا تھا، ارینج ہوئی یا نہیں“ ”میں نے لپک کر کینٹین سے کولڈ ڈرنکس پکڑیں اور جا بیٹھے مخصوص ڈبے میں۔ ہائے،

ڈبے کا ذکر ہی کیا، چار کنوارے لونڈے اور چھ لمبی سیٹوں پر مشتمل ایسا کونہ جسے اندر سے مقفل کیا جا سکتا تھا۔ جائے متعلقہ میں داخلے ہوتے ہی، لاہور کی گرمی میں بلال کو رضائی یاد آ گئی اور مجھے وہ دوست جو رضائے الٰہی سے بچھڑ چکے تھے۔ ٹرین کی آواز دھیمی آنچ پر دہکنے لگی اور ریلوے سٹیشن پیچھے کو سرکنے لگا۔ اتنے میں ٹی ٹی آن پہنچا، ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ دیکھتا جاتا تھا اور ہمیں گھورتا جاتا تھا، پھر کہنے لگا "تم میں سے عورت کون ہے؟" ہم چپ، ادھر وقار کی ہنسی چھوٹی ادھر جواد نے وقار کو تھپڑ دے مارا۔ ہمیں ہنسی کے دورے اور ٹی ٹی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ چند منٹ میں بات آئی گئی ہو گئی اور ٹی ٹی رفو چکر۔

اگر آپ نے دوستوں کے ساتھ سفر کیا ہے تو آپ کو یہ بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ ٹی ٹی کے جانے بعد اور ٹرین کے منزل پر پہنچنے کی سیٹی بجنے کے درمیان کیا کچھ ہوا، رات کیسے گزری، یا ہم نے اسے کیسے گزارا۔ البتہ اگر آپ کو ایسے سفر کا تجربہ نہیں تو میرا مشورہ یہی ہے کہ ایک بار سفر کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

سفر قہقہوں سے ہوتا ہوا سرگوشیوں اور پھر لمبی چپ میں بدل چکا تھا۔ ملتان کے تاریخی حوالوں سے ہمارا دماغ اٹا پڑا تھا مگر تجربات کی زنبیل خالی۔ ٹرین کی کھڑکی سے باہر دور کہیں اک آدھ بلب ٹمٹماتا نظر آتا اور پھر پیچھے کو دوڑ جاتا۔ رفتہ رفتہ اندھیرا چھٹنے لگا، صبح ہونے لگی، ٹرین کی رفتار دھیمی ہوتی گئی اور ہماری آنکھیں روشن۔

ادھر سورج لو دینے لگا ادھر ہم ٹرین سے باہر نکلے۔ وسیم نے ملتان کی گرمی کے ہمراہ ہمارا استقبال کیا۔

وسیم کے اوصاف حمیدہ آپ سے کیا بیان کروں، نستعلیق آدمی، گاڑی چلانے کا ماہر مگر راستوں سے ایسے ہی ناواقف جیسے ہم ایسے شریف، لاہور میں رہتے ہوئے بھی ہیرا منڈی سے ناآشنا ہیں۔ ہم ٹرین سے باہر نکلے تو وسیم کو منتظر کھڑے پایا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے جھٹ ہمارا سامان گاڑی میں رکھا اور ہم ملتان سے مظفر گڑھ کو روانہ ہوئے۔ آم کے باغات کے جھومتے جھرمٹ دور تلک پھیلے ہوئے تھے اور درمیان سے گزرتی سڑک ہمیں مظفر گڑھ لے جا رہی تھی۔ کچی امبیوں کی مہک نے بچپن کی وہ دوپہریں یاد دلوا دیں جب ہم ماموں کے گاؤں جایا کرتے تھے اور چلتی دھوپ میں کچے آم توڑ لایا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

منجمد راہیں

یاسر ہاتھ لیدر کوٹ میں گھسائے پارک میں موجود روشوں پر پانی کی مانند رواں تھا۔ روشوں کے اردگرد پھولوں کی بہتات تھی۔ یہ پھول یاسر کو بہت بھاتے تھے۔ وہ اپنا دماغی خلل یہاں آ کر ختم کیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ انھی روشوں پہ گھومتا پھر رہا تھا۔ پھولوں کی مسحور کن خوشبو اس کا دل و دماغ لبھا رہی تھی۔ پھر ایک زہر انگیز یاد اس کے سامنے آ گئی۔ یاسر پورے جی، جان سے لرز گیا۔ اس کا چہرہ لرزش کا شکار ہو گیا۔

اس کے سامنے ایک مفلوک الحال عورت آ گئی تھی۔ اس کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ بدبو کے شدید بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ یاسر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ یہ مفلوک الحال عورت اور کوئی نہ تھی بلکہ یاسر کی سابقہ بیوی تھی۔ وہ بیوی جس کی ذرا سی ناراضی یاسر کو بے چین کرتی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکن یاسر برداشت نہیں کرتا تھا۔ یاسر اپنے تئیں اسے دنیا کی ہر آسائش مہیا کیا کرتا تھا۔ جب بھی کوئی نیا لباس مارکیٹ میں آتا، یاسر اپنی بیوی کے لیے لے آتا تھا۔

مگر اس کی بیوی ہمیشہ ناک، بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ اسے شدید زدو کوب کا نشانہ بنایا کرتی تھی۔ یاسر اس کے جتنے ناز نخرے اٹھاتا، وہ اسی قدر اس سے بے زار رہتی۔ اس کی پسند کے لائے کپڑے کسی فقیر عورت کو دے دیتی یا پھر جلا ڈالتی۔ یاسر اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا تو وہ لقمے تھوک دیتی۔

”مت کھلاؤ مجھے اپنے زہر آلود ہاتھوں سے کھانا۔ میں یہ زہر مار اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں کر سکتی۔“ اس کی بیوی اس پر چلائی۔

”لیکن علیزہ! میں تمھارا شوہر ہوں۔ تم میری راحت ہو۔ دل کا سکون ہو۔ میں تمھارے بغیر ادھورا ہوں۔ تم ہو تو میں مکمل ہوں۔ کبھی میری پذیرائی بھی کر دیا کرو۔ میں اس کا حق رکھتا ہوں۔“

”تمھاری پذیرائی کرتی ہے میری جوتی۔ میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی لیکن......!“ علیزہ نے نفرت سے کہا اور ساتھ ہی اس نے یاسر کے اوپر کھانا پھینکتے ہوئے سچ مچ اس کے منھ پر تھوک دیا۔ علیزہ کی آنکھوں میں نفرت کی آگ جل رہی تھی۔

بابر امین ابر

اس بار یاسر کی آنکھوں میں غصے کے چراغ جل اُٹھے۔ یہ مردانہ انا کی تذلیل تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا تو علیزہ ڈر گئی۔ اس وقت ڈرتی ہوئی علیزہ یاسر کو اس قدر معصوم لگی کہ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لے۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہو جاتی ہیں۔ علیزہ! تم میری محبت ہو۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ بھی برداشت ہے۔'' یاسر نے چہرے سے تھوک صاف کیا اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم جیسا ڈھیٹ شاید ہی اس دنیا میں کوئی اور ہو۔ تم پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔'' علیزہ نے غصے اور نفرت سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ علیزہ سو رہی تھی۔ یاسر کھڑا اس کا ملکوتی حسن دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو علیزہ کو اس سے دور کھینچ رہی ہے۔ علیزہ اس کی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ وہ اس سے دور کیوں ہے؟ علیزہ کو اس سے اتنی نفرت کیوں ہے؟

پھر یہ عقدہ تب کھلا جب علیزہ عدالتی نوٹس کے ذریعے اس سے طلاق لے کر ایک مالدار شخص کے ساتھ چلی گئی۔ وہ اس کا سب کچھ تھی۔ جاتے وقت اس کی دنیا اندھیر کر گئی۔ آج اسے وہ اس حالت میں ملی تھی۔

اب وہ اس کے عقد سے آزاد تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر یاسر کے دل سے بے اختیار ایک ہوک نکل گئی۔

''خدا کے لیے مجھے کچھ کھانے کے لیے دے دو۔ میں تین دن سے بھوکی ہوں۔''

علیزہ نے اس سے بھیک مانگی تو یاسر کا دل جیسے کٹ سا گیا۔ علیزہ اپنی میلی میلی اور مچی مچی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ لیکن اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو عرصہ پہلے خود ہی اپنی راہیں منجمد کر کے چلی گئی تھی۔

پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، خدا ترسی کرتا وہ اسے کینٹین تک لے گیا۔ اسے کھانے کے لیے کچھ خرید کر دیا اور بھاری دل لے کر چلا گیا۔

دو روز بعد یاسر پھر دل کا بوجھ ہلکا کرنے پارک چلا آیا۔ ان دو دنوں میں وہ اس انسان کے جیسی تپش کھاتا رہا جسے زندہ آگ میں جھلسایا جائے۔ اس نے پارک کے ایک کونے میں علیزہ کی گٹھڑی بنی لاش اور ہجوم دیکھا۔ سب وہاں کھڑے تھے۔ کوئی بھی اس کا کفن دفن کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ پھر دل نے یاسر کو مجبور کر ڈالا۔ اس نے علیزہ کا کفن دفن کر دیا۔ اس کے تئیں علیزہ نے اپنی راہیں منجمد کی تھیں لیکن یاسر نے تو کبھی بھی اس پر راہیں منجمد نہیں کی تھیں۔

☆☆☆☆☆

یہ کہانی ہے کمرے کی

کنزیٰ خالق

میرا کمرہ۔۔۔ کتنی سسکیوں کا رازدار۔۔ کتنی مسکراہٹوں کا گواہ۔۔۔ کتنی سرگوشیوں کا امین۔۔ اس کمرے نے میرے تسلط میں آنے تک اور میں نے اس کی آغوش میں پناہ لینے تک ارتقا کی کئی منازل طے کی ہیں۔۔ جانے میں کمروں سے بھاگتی۔۔ کھلی ہوا کی متلاشی رہی یا کمرے مجھ سے گریزاں رہے۔۔

مشرق کے روایتی مخلوط خاندانی نظام میں کمرہ۔۔۔ ذاتی کمرہ۔۔۔ ایک بہت بڑی عیاشی تصور کیا جاتا ہے۔ بہت چنیدہ لوگ ہی اس عیاشی کے متحمل ہوسکتے ہیں اور جانے خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے۔۔۔ ہم۔۔ ان لوگوں میں شامل نہیں ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر کمرہ۔۔ بانٹنا پڑا۔ ہاسٹل کے دو سال بھی کمرے کی محبت میرے دل میں جگانے میں ناکام رہے۔ ڈپارٹمنٹ اور ادبی فورم کی دو کشتیوں کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد کمرے کے بجائے ایک آرام دہ بستر کی حاجت زیادہ شدت سے محسوس ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال کے مختصر عرصے میں تین کمرے بدلے۔ اور ان کمروں کے ساتھ نظر کے زاویے بھی۔۔ ہر کمرے کی کھڑکی نے سوچ کے نئے دروا کیے، تو کمرے کے مکینوں نے رنگ رنگ کے رویے برتنے سکھائے۔۔

کمرہ در کمرہ ہجرتوں اور تجربوں کا بارِ گراں اٹھائے میں گھر لوٹی تو وہ منتظر تھا۔۔ گویا میری ہی راہ تک رہا ہو۔۔ میرا موجودہ کمرہ۔۔۔ کمرہ کیا ہے۔۔ ایک بستر۔۔ اس کے قرب و جوار میں بھی میری مختصر سی دنیا اور دنیا کو سینت کر رکھنے کی کوششوں میں ہلکان ہوتی۔۔۔ میں۔۔۔ دن بھر کی تھکن چھتا تکیہ خوابوں کی سہولت دیتا ہے۔۔ کوئی خواب تکیے سے سرک کر سرہانے جاٹکتا ہے اور ہر صبح اپنی تکمیل کی یاددہانی کراتا ہے تو کوئی آنکھوں کے زینے اترتا دل میں جا پناہ لیتا ہے۔۔۔ سب کی نظروں سے اوجھل۔۔ دل کے کسی کونے میں پڑا میٹھی سی کسک سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ ایک کونے میں دھرا رنگوں کا

جہاں اور اس میں مقید دھنک رنگ دنیا-- جو للچاتی ہے-- ترغیب دیتی ہے اور فرصت کا تقاضا کرتی ہے- دوسری طرف کتابوں کا ایک طویل اور قدیم شیلف جس پر دھری نصاب اور مطالعے کی کتابوں کے آس پاس آج بھی دادا جان کے کتابوں کی مہک سانس لیتی ہے- وہ کتابیں جو ان کی وفات کے بعد نشانی کے طور پر بانٹ لی گئیں اور ہمارے حصے میں آیا-- ان کا مختصر-- لیکن پُرسکون سا کمرہ-- بستر کی دائیں جانب جانے کس رو میں بہہ کر سجایا گیا-- دنیا کا نقشہ-- جو تکیے سے فرار پاتے خوابوں کو پنکھ لگا دیتا ہے-- اس کے پہلو میں چھپاں کچھ یاددہانیاں-- جو نفسیات کے نصاب سے متاثر ہو کر کمرے کی زینت بنائی گئی ہیں-- کمرے کے بیچوں بیچ مطالعے کی میز-- اس پر دھرا مخمل لیمپ-- بائیں ہاتھ پر بک شیلف اس میں ترتیب وار بجی شائع شدہ تخلیقات کی نشانیاں اور منتخب کتب کا قیمتی ذخیرہ-- انھی کے بیچ خاموشی سے دھری ڈائری......

میری چھوٹی ہمشیرہ جنھیں میری موجودہ روم میٹ ہونے کا شرف حاصل ہے ان سے کمرے کی بتی بجھانے کے مسئلے پر ایک طویل بحث ہوتی ہے-- پرائیویسی کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے بھائی گزرتے گزرتے بھی کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکنا اور تفتیش کرنا فرضِ عین گردانتے ہیں-- صحن کی قربت کے باعث جہاں بارشیں دعوت نظارہ دیتی ہیں وہیں آندھیاں ہولاتی ہیں-- اور کرکٹ کے متوالوں کے شوق کا تاوان ہمیں کمرے میں نظر بند ہونے کی صورت ادا کرنا پڑتا ہے...... بصورت دیگر وقت بے وقت بیدار ہونے والی شاہد آفریدی کی روح گیند سے کسی کے چودہ طبق روشن کر کے ہی دم لیتی ہے--

صبح بستر سمیٹ کر کمرے سے نکلنا اور چند منٹ بعد ہونے والی واپسی پہ قدم بوسی پہ آمادہ بستر کی چادر اور سرہانوں کی بدلی ہیئت-- بیرونی حملے کا عندیہ دیتی-- منہ چڑاتی ہے--

کمروں سے اس قوم کی محبت کا یہ عالم ہے-- کہ ڈرائنگ روم-- بیڈ روم کے بجائے سونے والا کمرہ-- ٹی وی والا کمرہ-- قالین والا کمرہ-- اے سی والا کمرہ-- مہمانوں والا کمرہ کہنے میں دلی خوشی محسوس کرتے ہیں-- اور اس قوم کی فخریہ پیشکش ہونے کے ناطے ہم بھی اس تابندہ روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں--

کیونکہ ہمارے گھروں میں ایک کا بیڈ روم دوسرے کا ڈرائنگ روم ہوتا ہے-- اور ٹی وی کے سامنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ٹانگیں دراز کر کے بیٹھے بغیر نہ تو چیختی چنگھارتی خبروں کا سرا ہاتھ آتا ہے اور نہ ڈرامے سے کوئی جذباتی وابستگی محسوس ہوتی ہے--

خیر اب تو اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ ٹانگوں یا میز پر دھر کر ذاتی سینما سے محظوظ ہونے کا دور ہے--

میرے کمرے میں انسانی بقا کے لیے ضروری تصور کیے جانے والے تمام لوازمات موجود ہیں - سٹیشنری کا کوئی سامان درکار ہو تو ٹیبل پر دھرا پنسل باکس اور اس کے قرب وجوار میں موجود اشیاء کے استعمال کے لیے کسی کو میری اجازت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی-- سٹیپلر--ناخن تراش-- کنگھی-- بال پوائنٹ-- پیپر-- فائلز-- مہندی-- چوڑیاں-- ناخن پالش--سکاچ ٹیپ-- گوند-- قینچی--غرض چھوٹے بڑے-- ہر ایک کی دلچسپی اور ضرورت کی ہر چیز اس چھوٹی سی پٹاری میں دستیاب ہے-- یہ اور بات کہ جب مجھے کسی شے کی ضرورت پیش آئے تو اپنی چیز کی تلاش میں پورے گھر کی تلاشی لینی پڑتی ہے--

غرض میرا کمرہ محض میرا کمرہ نہیں بلکہ رفاہ عامہ کا ایک ادارہ ہے جس سے ہر ایک اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق فیض پاتا ہے-ایک غیر معروف عالمی سروے کے مطابق ضرورت کے وقت بڑا شاپر-- اور جمعہ کے دن ناخن تراش-- ہمیشہ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں- لیکن میرے کمرے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا--

ناخن تراش کی تلاش ہو یا چارجر کا تقاضہ-- ڈھونڈنے والے کی منزل یہی کمرہ ٹھہرتا ہے--

بات میرے کمرے سے شروع ہو کر یہیں آ کر ختم ہوتی ہے-- کہ میں اپنے کمرے سے نکلوں تو کچھ اور سوچوں--

اس کمرے کا اپنا آسمان ہے اور اپنی زمین-- تاحال اس سے زیادہ کی حاجت محسوس نہیں ہوتی--

ایک شعر میرے کمرے کی نذر-- (راحت اندوری سے معذرت کے ساتھ)

میرے "کمرے" میں نہیں اور کہیں پر رکھ دو--
آسماں لائے ہو؟ لے آؤ--- زمیں پر رکھ دو--

☆☆☆☆☆

العادل

موسم گرما کی طویل تعطیلات گزار کر جب میں کالج پہنچا تو بیرونی دیوار اللہ کے ننانوے ناموں سے سجی ہوئی تھی۔ سنہری رنگ، نفیس خطاطی، اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ایک مقدس خاموشی۔ پہلا نام الرحیم تھا۔

میں بائیک آہستہ آہستہ چلاتا ہوا نام پڑھتا گیا۔ الرحیم، الکریم، الغفور... اور جب کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہوا تو آخری نام العادل تھا۔

دل میں اچانک ایک بے نام سا سوال اٹھا: نجانے ہمیں اللہ کے ننانوے ناموں میں سب سے زیادہ الرحیم ہی کیوں پسند ہے؟

کالج کے اندر داخل ہوا تو برآمدے کے آخر میں کنٹرول امتحانات کے دفتر کے باہر ایک سنہری نیم پلیٹ لگی تھی:

پروفیسر جام عبدالرحیم قادری، صدر شعبہ معاشیات۔

☆☆☆

قادری صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ طلبہ کے لیے رحمت ہیں۔ ایسی رحمت جس کے ہاتھ میں ترازو ہے، مگر اس پر کبھی وزن نہیں رکھا گیا، صرف پلڑے جھکائے جاتے ہیں۔ کبھی ادھر تو کبھی اُدھر۔

کوئی فیس لیٹ جمع کرانے آتا تو وہ مسکرا کر ہاتھ ہلا دیتے۔

کوئی رول نمبر سلپ گم کر بیٹھتا تو فائل میں سے نئی نکلوا دیتے۔ کوئی پیپر میں ''مدد'' مانگتا تو وہ ایسی مدد کرتے کہ سوال کی حرمت تک باقی نہ رہتی۔ میں نے انھیں کبھی سخت بولتے نہیں دیکھا تھا۔ چہرے پر ہمیشہ ایک نرم سی لکیر رہتی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔

وہ اکثر طلبہ سے کہتے ہوئے پائے جاتے:
''بیٹا، فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

خالد نذیر

اور واقعی، سب ٹھیک بھی ہو جاتا- حاضری پوری، نمبر بڑھ گئے، جرمانے معاف، فائلیں ہلکی، دستخط آسان- ابتدا میں مَیں نے اسے ایک مثالی استادی دردمندی سمجھا-

مگر پھر ایک صبح امتحان ہال میں وہی مسکراہٹ دیکھی، جب نقل کے پرچے آہستگی سے میزوں کے نیچے سرکائے جا رہے تھے- اور شام کو وہی مسکراہٹ ہوٹل کی میز پر دیکھی، جہاں وہی طلبہ ان کے ساتھ قہقہے لگا رہے تھے-

اسی دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مہربانی اگر حد سے بڑھ جائے، تو انصاف کا گلا گھونٹ دیتی ہے-

ان کے کمرے کی دیوار پر ایک فریم لٹکا تھا- کسی بااثر سیاسی شخصیت کے ساتھ تصویر- قادری صاحب ذرا پیچھے کھڑے تھے، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ - سیاسی شخصیت صوفے پر بیٹھی کسی فائل کے ورق پلٹ رہی تھی- قادری صاحب یہ تصویر بڑے فخر سے دکھایا کرتے-

"بڑے گہرے مراسم ہیں، ہمارے فیملی تعلقات ہیں ان کے ساتھ" وہ اکثر یہ جملہ دہراتے جب انھیں کسی پر اپنا اثر رسوخ ظاہر کرنا ہوتا تھا-

ان کی میز پر شیشے کے نیچے ایک جملہ چپکا تھا:
"تم رحم کرو اہلِ زمین پر، خدا رحم کرے گا عرشِ بریں پر-" یہ جملہ ان کے مزاج کی تعریف بھی تھا اور پردہ بھی-

☆☆☆

میں اس وقت لیکچرر تھا، مگر دل میں طالب علم ابھی زندہ تھا- کتابی باتیں مجھے خوب صورت لگتی تھیں، مگر راہداریوں میں لکھے، اخلاقی اور سبق آموز جملے اکثر میرے ایسے سوال بن جاتے تھے جو دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث ہوتے- جس کی وجہ سے لوگوں سے میرے تعلقات بہتر نہیں ہوتے تھے-

ایک دن میں نے حوصلہ کیا-

قادری صاحب کرسی پر ذرا پیچھے ہو کر بیٹھے تھے، جیسے عدالت لگائے بیٹھے ہوں- سامنے چند طلبہ کھڑے تھے- ایک کی نظریں جھکی ہوئی، دوسرے کی انگلیاں بے چین- فائل بند کی، قلم رکھا، اور آہستہ سے بولے:
"بیٹا، فکر نہ کرو ...... سب ٹھیک ہو جائے گا-"

طلبہ نکل گئے- میں بیٹھ گیا- انھوں نے مسکرا کر کہا:
"خالد صاحب! خیریت؟" میں نے کہا:
"سر، ایک بات پوچھنی تھی-"
"پوچھیں، سوال کا حق سب کو ہے-" میں نے ایک سانس میں کہا: "آپ طلبہ کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کرتے ہیں- آپ انصاف اور میرٹ پر سمجھوتہ کرتے ہیں- یہ غلط ہے-" مجھے ایسے لگا جیسے میں

نے شیشے پر پتھر مار دیا ہو۔ مگر شیشہ سلامت رہا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر بولے:

''لوگوں کے ساتھ رحمت والا معاملہ کرنا چاہیے - آسانیاں پیدا کرنی چاہییں، رکاوٹیں نہیں۔''

جملہ اتنا خوب صورت تھا کہ لمحہ بھر کو مجھے بھی لگا میں ہی سخت دل ہوں۔ میں نے کہا:

''غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے، سر! لقل، سفارش، یہ کیا ہے؟'' وہ ہنسے۔ ایسی ہنسی جس میں یقین ہوتا ہے کہ سامنے والا ابھی دنیا نہیں جانتا۔ اور نا ہی دنیا کے معاملات سے باخبر ہے۔

☆☆☆

پھر ایک وقت آیا کہ قادری صاحب پرنسپل کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ سیاسی مدد سے یا گھریلو تعلقات کی بنا پر، مگر بن گئے۔ نیا دفتر، نئی کرسی، بڑا فریم۔ دیوار پر پھر وہی سیاسی تصویر، بس اب ذرا سائز بڑا ہو گیا تھا۔

انھوں نے کہا:

''یہ سب اللہ کی رحمت ہے مجھ پر۔ ہم لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں تو اللہ اپنے کرم کی بارش کرتا ہے۔''

کالج کے اکاؤنٹ میں کافی پیسے بچے تھے۔ پچھلا پرنسپل خرچ کرنے کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ مسئلہ رقم کے زیادہ ہونے نہیں تھا، مسئلہ یہ تھا کہ ان پیسوں کو خرچ کیسے کیا جائے۔ ایک دن کلرک حیدر علی کو بلایا گیا۔

''کالج کی ترقی کو کیسے ممکن بنایا جائے؟''

حیدر علی کلرک مسکرایا:

''کنسٹرکشن کا کام سر جی! اخراجات کی کوئی حد نہیں ہوتی اور نا ہی کوئی ریکارڈ۔''

حیدر صاحب،'' انھوں نے دھیمی آواز میں کہا،'' کالج کی بیرونی دیوار پر اللہ کے ننانوے نام پینٹ کروا دیں - اچھے خوب صورت خطاطی کے ساتھ - یہ بھی تو نیک کام ہے نا؟''

حیدر علی نے حیرانی سے پوچھا، ''سر، لیکن...''

''سوچیں حیدر صاحب،'' پروفیسر صاحب کی آواز میں وہی پرانی نرمی تھی،'' پینٹ کی قیمت، مزدوری، خطاطی کی فیس... اور پھر کچھ مہینوں بعد بارش، دھوپ... نام مٹنے لگیں گے۔ پھر دوبارہ کروانے پڑیں گے۔ آڈٹ میں کون پوچھے گا کہ پینٹ کتنے کا تھا؟ نیک کام جو ہے۔''

حیدر علی کے چہرے پر سمجھ کی ایک مسکراہٹ آئی اور ایک گئی۔

میں اب جب بھی کالج کی دیوار کے پاس سے گزرتا ہوں، العادل کے نام کو سوالیہ انداز سے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں، رحمت اگر انصاف کے بغیر ہو، تو وہ رحمت کس کے لیے ہوتی ہے؟

☆☆☆☆☆

نمک کی وادی

شمال کے آخری کنارے پر ایک وادی تھی جسے لوگ نمک کی وادی کہتے تھے۔ اس کا نام اس لیے نمک نہ تھا کہ وہاں زمین سے نمک نکلتا تھا بل کہ اس لیے کہ اس زمین میں رہنے والوں کی آنکھوں کا پانی وقت کے ساتھ نمک بن گیا تھا۔

کئی صدیوں سے یہ وادی کسی نقشے پر پوری طرح درج نہ تھی۔ سلطنتیں بدلتی رہیں، پرندوں کے راستے بدلے، سمندروں کے کنارے پیچھے ہٹتے رہے، مگر وادی اپنی خاموشی میں قائم رہی۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اس کے پہاڑوں کے نیچے "سیاہ آگ" ہے۔

سیاہ آگ جو شہروں کو روشن کر سکتی تھی، کارخانوں کو زندہ رکھ سکتی تھی اور سلطنتوں کے زنگ آلود بازوؤں میں نئی طاقت بھر سکتی تھی۔

دنیا کے نقشے پر وادی پہلی بار واضح ہو گئی۔

پہلے ماہرین آئے، پھر معاہدے آئے، پھر قرضے آئے، پھر مشورے آئے اور آخر میں فوجی اڈے۔

مگر ان سب کے باوجود ایک مسئلہ باقی تھا۔ وادی کے بیچ رہنے والا ایک چھوٹا سا قبیلہ "حافظ"۔

وہ زمین کے مالک نہ تھے صرف اس کے محافظ تھے۔ ان کے بزرگ کہتے تھے:

"زمین ہماری نہیں ہم زمین کے ہیں۔"

یہ جملہ عالمی اقتصادی لغت میں شامل نہ ہو سکا۔ ایک دن قبیلے کے بڑوں کو بلایا گیا۔ بڑے خیمے میں دنیا کے کئی جھنڈے تھے مگر سب کے سائے ایک جیسے تھے۔

ان سے کہا گیا:

"دنیا بحران میں ہے۔ توانائی ختم ہو رہی ہے۔ کروڑوں انسان اندھیرے میں جا سکتے ہیں۔ تم صرف اپنی وادی خالی کر دو۔ تمھاری قربانی انسانیت بچا لے گی۔"

قبیلے کے سردار نے پوچھا:

اور ہمارے بعد؟

جواب آیا:

تمھیں تاریخ یاد رکھے گی۔

وہ بوڑھا مسکرایا۔

"تاریخ قبر نہیں ہوتی جہاں آدمی دفن ہو کر امر ہو جائے۔"

بات ختم نہ ہوئی۔

نوید عاقل

شہر کے اخبارات بولنے لگے۔

”حافظ ترقی دشمن ہیں۔ یہ چند لوگ پوری دنیا کے مستقبل کو یرغمال بنائے بیٹھے ہیں۔ انسانیت کے دشمن۔“

پھر وادی کے باہر کے لوگ بھی بولنے لگے:

”اگر تم چند ہزار لوگ کروڑوں کے لیے نہیں ہٹ سکتے تو تمہارا وجود کس کام کا؟“

دباؤ بڑھتا گیا۔

آخر قبیلے کے اندر دراڑ پڑی جوانوں نے بزرگوں سے کہا:

”اگر واقعی ہماری قربانی سے لوگ بچتے ہیں تو ہمیں مان جانا چاہیے۔“

بوڑھے خاموش رہے۔

ایک رات وادی کے مرکز میں آگ جلائی گئی۔

فیصلہ ہوا۔

قبیلہ خود وادی چھوڑ دے گا۔ لوگ نکلنے لگے۔

اپنے مردے، اپنے درخت، اپنے نام، اپنی زبان سب پیچھے چھوڑ کر۔

روانگی کے دن ایک بوڑھی عورت نے مٹی کو چھوا اور کہا:

”یہ زمین آج نہیں روئے گی... زمین کو رونے میں وقت لگتا ہے۔“

پھر مشینیں آئیں۔ پہاڑ کاٹے گئے۔ سیاہ آگ نکالی گئی۔ شہر روشن ہوئے۔ کانفرنسیں ہوئیں۔ ایوارڈ دیے گئے۔ کہا گیا:

”یہ انسانی تعاون کی عظیم مثال ہے۔“

چند برس بعد ایک نئی رپورٹ آئی۔

اس میں لکھا تھا:

”حافظ قبیلہ غیر موثر معاشرتی ڈھانچہ رکھتا تھا۔ ان کی منتقلی ناگزیر تھی۔“

پھر نئی نسل کی کتابوں میں پڑھایا گیا:

”وسائل کے استعمال میں مقامی مزاحمت اکثر ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔“

کسی نے نہ لکھا کہ وہ خود ہٹ گئے تھے۔ کسی نے نہ لکھا کہ انھوں نے لڑائی نہیں کی۔ کسی نے نہ لکھا کہ انھوں نے اپنی قبریں ساتھ نہیں اٹھائیں وقت گزرا۔

ایک دن سیاہ آگ ختم ہونے لگی، کمپنیوں نے نئے نقشے نکال لیے، فوجی اڈے سمیٹ لیے گئے، کانفرنسیں دوسری جگہ منتقل ہو گئیں، وادی پھر خالی ہو گئی، صرف نمک رہ گیا۔

کئی سال بعد ایک مسافر وہاں پہنچا۔

اس نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر جلے ہوئے حروف دیکھے:

”ہم نے دنیا بچائی تھی
پھر دنیا کو ہم سے نجات چاہیے تھی۔“

مسافر نے مٹی اٹھا کر دیکھی۔

وہ نمکین تھی۔ اس نے سوچا:

شاید بعض قومیں مرتی نہیں
پہلے ان سے قربانی لی جاتی ہے، پھر ان کے وجود کو غلط ثابت کیا جاتا ہے۔

اور یہی تہذیب کا سب سے مہذب ہتھیار ہے۔

وادی خاموش رہی۔

کیونکہ بعض سچائیوں کو چیخنے کی ضرورت نہیں ہوتی---
وہ نمک بن کر نسلوں کی زبان پر لگ جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

خالد احمد

دن رات محو اپنی ثنا خوانیوں میں تھا
خالد بھی اپنے عہد کے خاقانیوں میں تھا

پایا حصار خاک کے آگے حصار آب
خشکی کے ساتھ میں بھی گھرا پانیوں میں تھا

کیا تجھ پہ سج رہا تھا مرا خوں میں تر لباس
شامل مرا لہو ، تری قربانیوں میں تھا

قیدی کوئی نہ وقت سے پہلے رہا ہوا
لمحہ بھی ، اپنے عصر کے زندانیوں میں تھا

مسمار کر چلے ، مرے معمار کیوں مجھے
کچھ نقص مجھ میں تھا کہ مرے بانیوں میں تھا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

اِدھر جو دیکھ لے تُو اک نظر تو بسم اللہ
تجھے گوارا نہ ہو بھی اگر تو بسم اللہ

کب اپنی سوچ کا کچھ کام، کیا قدم اِقدام
یہ زندگی ہے بھنور کا سفر تو بسم اللہ

میں دے رہا ہوں اُسے صبح و شام دعوتِ امن
مُصر ہے پھر بھی عدو جنگ پر تو بسم اللہ!

ترے بھی ہاتھ میں پتھر ہمارے نام کے ہیں
ترا بھی من، کہ ہوں بستی بدر تو بسم اللہ

تجھے ہے خبط بنا کر مجھے نشانِ طعن
نگاہِ غیر میں ہو معتبر تو بسم اللہ

یہ کیا کہ ہاتھ ملانے سے بھی گریز اُس کو
وہ کم لحاظ ہوا اِس قدر تو بسم اللہ

کھٹکتی ہے بہت اک جیسی شاعری عالی
کہے کوئی جو برنگِ دگر تو بسم اللہ

جلیل عالی

غزل

ہم کہاں اپنے جہانوں کے مکیں ہوتے ہیں
صبح ہوتے ہیں کہیں شام کہیں ہوتے ہیں

عرش والے سے بھلا کیوں انہیں منسوب کریں
حادثے جو بھی تہہِ عرشِ بریں ہوتے ہیں

اکثر اوقات نہ ہونے کا گماں ہوتا ہے
لوگ کہنے کو مگر اہلِ یقیں ہوتے ہیں

یہ ترا کام ہے دیوار اٹھا پیڑ لگا
دھوپ ہوتی ہے جہاں سائے وہیں ہوتے ہیں

حرف در حرف یہ پھیلی ہوئی دنیائے خیال
ہم کہیں آپ کہیں لوگ کہیں ہوتے ہیں

اپنی اوقات سے بڑھ کر نہیں سوچا ہم نے
ہم وہیں پر ہیں جہاں خاک نشیں ہوتے ہیں

تو اکیلا تو نہیں اور بھی اس شہر کے لوگ
جیسے دکھتے ہیں حقیقت میں نہیں ہوتے ہیں

تھک گئے شہر کے لوگوں سے یہ کہتے کہتے
ہم اسی شہر کے باسی ہیں یہیں ہوتے ہیں

اک نظر دیکھ لیں پیوست رگِ جاں ہو جائیں
بس وہی لوگ کنور سب سے حسیں ہوتے ہیں

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

کسی کمین کو ہم رتبۂ شہاں نہ کریں
زمیں کی گرد کو ہم دوشِ آسماں نہ کریں

ہوا کو طاق میں اِس واسطے بٹھایا ہے
چراغ بجھنے سے انکار پر دھواں نہ کریں

یہ پتلیاں بھی یہیں کی ہیں، ہاتھ بھی یہیں کے
کہاں کریں یہ تماشا اگر یہاں نہ کریں

بیاں کریں سبھی اپنی حکایتیں لیکن
حقیقتوں کو تو تبدیل قصہ خواں نہ کریں

قبول کرنے پہ آئیں تو سو سلام قبول
نہیں تو ایک بھی عرضِ غرض پہ ہاں نہ کریں

کھِلے ہیں جن کی نگاہوں میں معرفت کے چمن
کبھی وہ خواہشِ گلگشتِ گلستاں نہ کریں

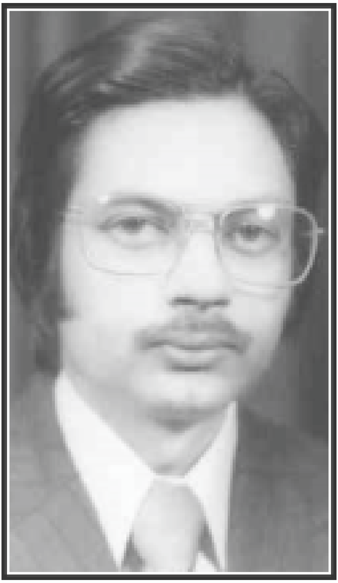

خاور اعجاز

خوابوں کا انبار لگائے بیٹھا ہوں
مَیں بھی کیا بازار لگائے بیٹھا ہوں

روند گئی مجھ کو دُنیا اور مَیں اَب تک
سینے سے اقدار لگائے بیٹھا ہوں

کیسا مانجھی ہوں، خود تو اِس جانب ہوں
اور کشتی اُس پار لگائے بیٹھا ہوں

بوئے سلطانی قائم ہے صحرا میں
ٹیلے پر دربار لگائے بیٹھا ہوں

جو خود اور کسی سے مانگیں، مَیں اُن سے
اُمیدیں بیکار لگائے بیٹھا ہوں

تاجر تھا مَیں لعل و جواہر کا لیکن
اَب ردّی اخبار لگائے بیٹھا ہوں

گزرے جاتے ہیں دشمن اور مَیں خاورؔ
بوسیدہ ریڈار لگائے بیٹھا ہوں

غزل

چار سُو پھیلتے غبار کا دُکھ
کس کو معلوم رہگزار کا دُکھ!

گدلے پانی میں گرنا پڑتا ہے
جان لیوا ہے آبشار کا دُکھ

آمدِ موسمِ خزاں کا خیال
ہے یہی موسمِ بہار کا دُکھ

پال لیتا ہے شاعرِ حسّاس
اپنے سینے میں صد ہزار کا دُکھ

زندگی کے سکون میں کانٹا!
بن چکا ہے کبھی کبھار کا دُکھ

اب تسلسل سے مل رہا ہے مجھے
پہلے جو تھا کبھی کبھار کا دکھ

تم بھلا منتظر رہے کب تھے؟
پوچھتے کیا ہو انتظار کا دکھ!

میں اکیلا ہی جھیلتا ہوں، مگر
میرے دُکھ میں ہے بے شمار کا دُکھ

دلِ نازک نہ جھیل پائے گا
روز و شب اور بار بار کا دُکھ !

ہجر کے دُکھ سے بھی زیادہ ہے
قُرب کے وقت انتظار کا دُکھ

کون سمجھے گا ، کیسے سمجھے گا
مجھ سے درویش خاکسار کا دُکھ

نسیم سحر

غزل

خُلع لینے سے پہلے سوچنا تھا
یہ کیسا جان لیوا فیصلہ تھا

الگ ہونا ، ضروری تو نہیں تھا
اگر اِک درمیانی راستہ تھا

یکایک جل اُٹھا ، جنگل کا جنگل
کہ پس منظر میں ٹِمبر مافیا تھا

پرندے اُڑ گئے ، سارے کے سارے
شِکاری پھر چمن میں آ گیا تھا

یہاں ، گردش میں تھیں ، کچھ اور خبریں
وہاں ، کچھ اور سوچا جا رہا تھا

کوئی آواز نہ اُٹھے کسی کی
یہ اُس نے اِبتداء میں کہہ دیا تھا

مسلسل تلاش کی کوششوں سے
چراغِ امن ، کیوں بجھنے لگا تھا

کسی کو اپنی طاقت کا نشہ تھا
کوئی میدان میں تنہا کھڑا تھا

جو دیکھا سولھویں منزل سے میں نے
کراچی ، دُور تک بکھرا پڑا تھا

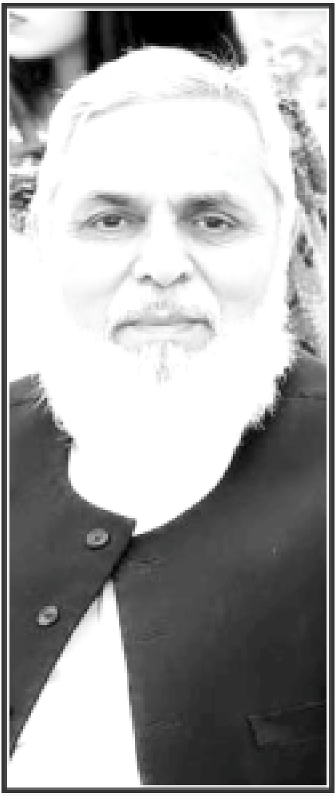

محمد انیس انصاری

غزل

حدودِ ذات سے باہر اب آ کر کیا کرو گے
ہجومِ درد و غم اتنا بڑھا کر کیا کرو گے

میں باشندہ نہیں ہوں روشنی کی بستیوں کا
مری مٹھی میں تم جگنو تھما کر کیا کرو گے

تعلق جب کسی صورت میں بھی باقی نہیں ہے
مری تصویر کمرے میں لگا کر کیا کرو گے

ضرورت کے مطابق لے لو کچھ رختِ سفر بھی
زمیں کا بوجھ کاندھوں پر اٹھا کر کیا کرو گے

بڑھاتے ہو عبث میری طرف یہ ریشمی ہاتھ
تم اک پتھر کو سینے سے لگا کر کیا کرو گے

میں اپنوں کے رویوں سے ہوں پہلے ہی پریشاں
مرے دل کی پریشانی بڑھا کر کیا کرو گے

دلوں پر جب مسلسل ایک وحشت سی ہے طاری
تبسم اپنے ہونٹوں پر سجا کر کیا کرو گے

ہمیشہ ساتھ رہنے کا ارادہ جب نہیں ہے
مجھے تم ہمسفر اپنا بنا کر کیا کرو گے

یہی تو چند لوگ اس شہر میں اپنے ہیں فرحان
انہیں بھی عہدِ نفرت میں گنوا کر کیا کرو گے

سرور فرحان

غزل

شہ دے کے بھی آتا ہے تنظرمات کا نقشہ
بگڑا ہے کچھ ایسا میرے حالات کا نقشہ

ہر ایک پہ بگڑے بھی تھے ہر ایک پہ برسے
جس جس نے بھی کھینچا مرے حالات کا نقشہ

مسرور تھا دل جب اسے یاد آئے وہ
ساون میں وہ جھولوں کا، وہ باغات کا نقشہ

مزدور کی بیٹی کے ہوئے ہاتھ نہ پیلے
بن بن کے بگڑتا رہا بارات کا نقشہ

افلاس نے خوشیوں کی ہر اک بات بھلا دی
اب یاد کسے عید کا، شب رات کا نقشہ

منزل کا تعین ہو، ملے خیر کا رستہ
پھیلایا ہے قرآن نے آیات کا نقشہ

اس چاند سے چہرے پہ چمکتے ہوئے قطرے
طوفان بلا خیز ہے برسات کا نقشہ

ساجد کو درِ گنج شکر پہ نظر آیا
جو ذہن میں تھا نور کی برسات کا نقشہ

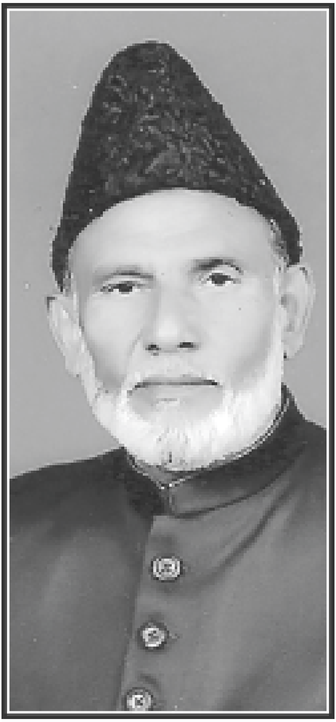

شریف ساجد

غزل

نبضِ رگِ حیات فتوری ہے ان دنوں
اِس کا کوئی علاج ضروری ہے ان دنوں

اب کون پھاندتا ہے چھتیں وصل کے لیے
بس ایک فون کال کی دوری ہے ان دنوں

ان کے لیے نہیں ہیں یہ قانون ضابطے
جن کے حضور اپنی حضوری ہے ان دنوں

جیتے ہیں کھا کے چھوڑا ہوا رزق آپ کا
اترن جناب کی ہمیں پوری ہے ان دنوں

آپس کی لین دین ہے وجہِ تعلقات
ہر ایک راہ و رسم عبوری ہے ان دنوں

پوری کروں گا سامنے اُس کو بٹھا کے میں
اپنی وہ اک غزل جو ادھوری ہے ان دنوں

راحت پتا ہے سب کو اہم کون کون ہے
اور کون کون غیر ضروری ہے ان دنوں

راحت سرحدی

غزل

بلا سے کوئی کہے ہم کو یہ شرابی تھا
جہاں جہاں سے بھی گزرے سماں گلابی تھا

توجہ ہم نے بھی رنگ روپ پر کہاں دی تھی
بہ رنگ آب وہی جرعہء خرابی تھا

صد حیف ہم لب ورخسار سے آگے نہ گئے
محبتوں کا سبق جو پڑھا نصابی تھا

رموز عشق میں کوئی شکست دے نہ سکا
ہمارا علم اس شعبے میں اکتسابی تھا

ہوا کے رخ پہ بھی جلنے کا حوصلہ پایا
بُجھے چراغ کا اقدام انقلابی تھا

شراب پی کے بھی قائم رہے ہمارے حواس
ہمارے چلنے کا انداز پر نوابی تھا

محبتوں کا صحیفہ تھی اس کی ذات اعجاز
ورق ورق تھا کھلا، چہرہ بھی کتابی تھا

اجمل اعجاز

غزل

زندگی ہم نے یوں لٹائی ہے
جیسے یہ مُفت میں کمائی ہے

روز ہوتے ہیں قتل بچے یہاں
کیا یہ فرعون کی خُدائی ہے؟

ہجر بارود کا لبادہ ہے
وصل جلتی دیا سلائی ہے

کِس کے قدموں کی چاپ سُنتے ہی
ہر کلی کھل کے مُسکرائی ہے

جب بھی بالوں میں اُنگلیاں پھیریں
ماں کے ہاتھوں کی یاد آئی ہے

بس تیری دید کے لیے باقی
بُجھتی آنکھوں کی رُوشنائی

چاند کے ساتھ ایک دوشیزہ
رات بھر جھیل میں نہائی ہے

آئے پلکوں پہ یاد کے جگنو
رات اپنی بھی جگمگائی ہے

جی حضوری ہے گوفیوں کا چلن
اِن کی خصلت میں بے وفائی ہے

پھر آنکھوں میں اشک آئے ہیں
جب غزل میؔر کی سُنائی ہے

چوڑیاں وہ اُداس لگتی ہیں
دُور جن سے تیری کلائی ہے

پیار اُس کا سنبھال کر رکھا
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

جن کی رسوائیوں کے چرچے ہیں
ان کو بھی زُعمِ پارسائی ہے

موت کی آہٹیں سنی ہیں عقیل
جاں کی پنجرے سے اَب رہائی ہے

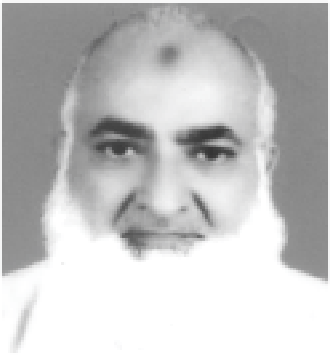

عقیل رحمانی

غزل

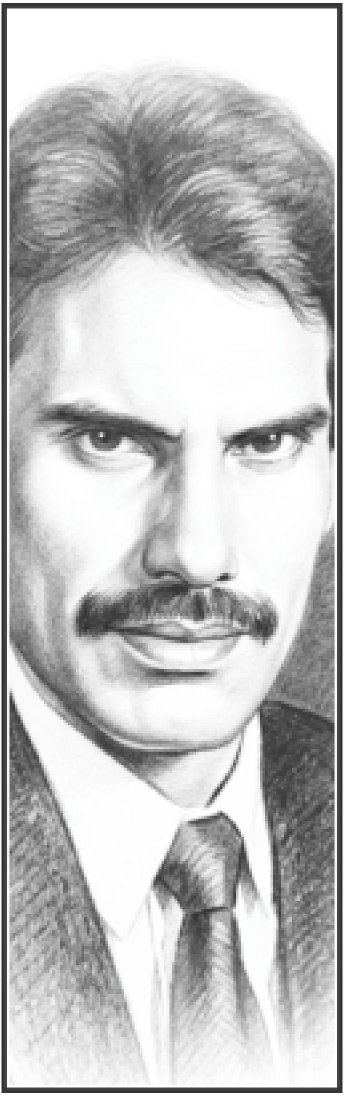

سفر میں ہے یہی گر آپ کی رفتار مشکل ہے
ہمارا آپ کا تو ساتھ پھر سرکار مشکل ہے

رہے قائم یہی تیرے اگر معیار مشکل ہے
ہماری جیت مشکل ہے تمہاری ہار مشکل ہے

حصار مصلحت کو توڑنا ہوگا تمہیں اک دن
مری سچائیوں سے دوستو انکار مشکل ہے

جہاں کاندھوں پہ سر اگنے کا موسم ہی نہیں آتا
ملے اس شہر میں تجھ کو کوئی دستار مشکل ہے

اگرچہ بات کرنے کے مجھے سو ڈھنگ آتے ہیں
مگر وہ بات ہی ایسی ہے کچھ اظہار مشکل ہے

مجھے بیم و رجا کے درمیاں رہنا نہیں آتا
کرو انکار تم کھل کر اگر اقرار مشکل ہے

جلیل آخر رہیں گی آپ کو خوش فہمیاں کب تک
خبر لائے کوئی اچھی یہاں اخبار مشکل ہے

احمد جلیل

غزلیں

کیسے لگے ہیں ہاتھ انہیں کا کروچ کے
ہلکان ہو گئے ہیں یہی سوچ سوچ کے

ہذیان بک رہے ہیں زمانوں سے آپ بھی
عادی ہیں ہم غریب بھی گالم گلوچ کے

بازوں کی راہ روکنے والا کوئی نہیں
لے جا رہے ہیں آج بھی چڑیاں دبوچ کے

پنجاب کے پی کے سے علیحدہ نہیں میاں
بھائی ہیں ہم تو آج بھی سندھی بلوچ کے

تختی ہے دل غریب کی تختی ہے کیا کرے
وہ تھک گیا ہے روز اسے پوچ پوچ کے

نیت نہیں تھی اس لیے آیا نہیں مگر
حیلے بہانے پھر وہی پاؤں میں موچ کے

مسعود کیسے خون ہے منہ کو لگا ہوا
پشتوں سے کھا رہے ہیں ہمیں نوچ نوچ کر

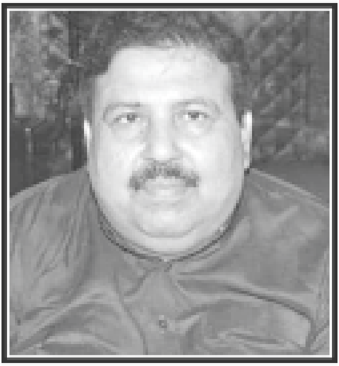

مسعود احمد

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
چوٹی پھر ایڑیوں سے سر نہ ہوئی

بجھ گیا دل کسی کے جاتے ہی
روشنی پھر وہ عمر بھر نہ ہوئی

ڈوب سکتا ہے چاند وحشت میں
وہ اگر کل بھی بام پر نہ ہوئی

یہ زمیں ہم کو کھود ڈالے گی
آسماں پر اگر نظر نہ ہوئی

بے خبر ہوں میں اک زمانے سے
کیا کسی کو مری خبر نہ ہوئی

ان پرندوں کے پاؤں دھرنے سے
کوئی بھی شاخ بے ثمر نہ ہوئی

سارے دروازے بھر دیے اس نے
ایک دیوار ہم سے در نہ ہوئی

دل بھی کیا ہو گیا ہے پتھر کا
گدگدی اس کو دیکھ کر نہ ہوئی

اس سلیقے کا کیا کریں جس میں
چیز کوئی ادھر ادھر نہ ہوئی

زندگی لاکھ مختصر تھی مگر
شامِ غم سے تو مختصر نہ ہوئی

مفتا مفتی میں کھینچتی ہے ہمیں
کیا یہ دنیا بھی مفت بر نہ ہوئی

غزل

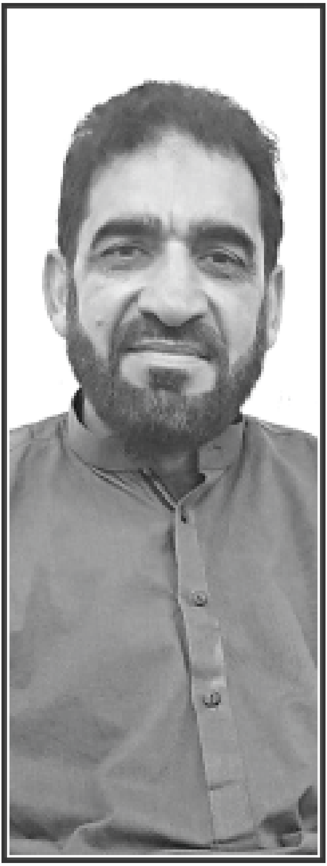

ایسا نہیں کہ لوگ سبک دوش ہو گئے
نفرت کی انتہا ہے کہ خاموش ہو گئے

درویش غم کو کھا گئے تقدیر جان کر
اشکوں کو یوں پیا کہ بلا نوش ہو گئے

آندھی چلی جو ظلم کی اس گرد باد میں
جلتے ہوئے چراغ سیہ پوش ہو گئے

دیکھا جو رقص کرتے بگولوں کو دشت میں
طوفاں کے سیل اور بھی پر جوش ہو گئے

ہمت تھی جن میں وقت سے آگے نکل گئے
جو عافیت پسند تھے کم کوش ہو گئے

وہ کس طرح نوشتۂ دیوار پڑھتے سعد
جو عشرتِ دو روزہ میں مدہوش ہو گئے

سعد اللہ شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قمقموں کی طرح قہقہے جل بجھے
میز پر چائے کی پیالیاں رہ گئیں

غزل

کنویں سے لوٹ کر آئی صدا یہاں کوئی ہے
اندھیری رات ہے جنگل ہے اب کہاں کوئی ہے

وگرنہ آج یہ سورج ہی بھون ڈالے گا
پناہ لے سکیں دیکھو تو سائباں کوئی ہے

وہ جس پہ دے سکو پہرا بھلا یہاں کوئی ہے
ہے کون پوچھے میاں آپ کی زباں کوئی ہے

مرے خدایا مجھے اس میں سرخ رو کر دے
جو چل رہا ہے یقیناً یہ امتحاں کوئی ہے

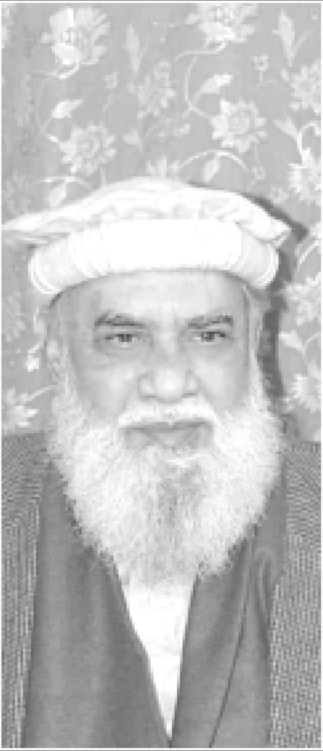

مدد کو آئے کوئی موت سے بچائے کوئی
کہ سانس رکنے لگی بھر گیا دھواں کوئی ہے

ہماری بستی کیوں طوفاں کی زد میں رہتی ہے
ہماری بستی پہ دیکھو تو آسماں کوئی ہے

ہمارے حق میں بھی اس کی کبھی کھلی ہے زباں
ہمارے حق میں بھی اس نے دیا بیاں کوئی ہے

وہ جس کی راہ میں تھی کہکشاں بچھا دی گئی
فرشتے راستہ تکتے تھے کہ یہاں کوئی ہے

جو بدگماں مجھے رکھتا ہے تیری رحمت سے
مرے خدایا ہمارے بھی درمیاں کوئی ہے

اکرم ناصر

غزل

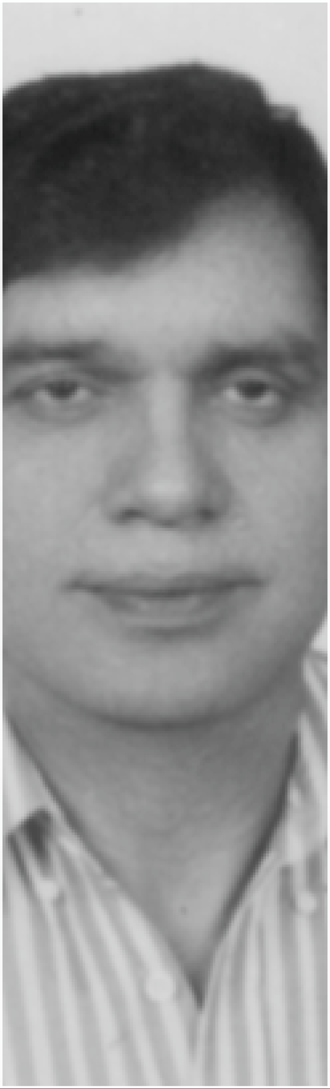

اپنے ہونے سے مُکرنا پڑ گیا
اک ذرا پہلے ہی مرنا پڑ گیا

میری سانسوں کا ٹکٹ پورا نہ تھا
آدھے جُھولے سے اترنا پڑ گیا

روح تک آئی ہے سلوٹ ہجر کی
جسم بھی شکنوں سے بھرنا پڑ گیا

وقت میری راہ پر آیا نہیں
خود کو ہی گمراہ کرنا پڑ گیا

ایک کھڑکی بند تھی ، اور بند ہے
پھول انگارے پہ دھرنا پڑ گیا

تجھ سے خوش رہنے کا وعدہ تھا مرا
عمر بھر تاوان بھرنا پڑ گیا

برف ہوتی آگ سی خواہش مری
جب بھڑک اٹھی تو ڈرنا پڑ گیا

قیوم طاہر

غزلیں

کوئی خیال کسی خواب سے ملاتے ہوئے
ہمارے ہاتھ جھڑے آئینے بناتے ہوئے
خدا نے ایک ہی مٹی کا انتخاب کیا
ہمارے ہونٹ تمہاری جبیں بناتے ہوئے
کوئی بھی شخص مرا دکھ سمجھ نہیں سکتا
میں آسماں سے گرا ہوں تجھے اٹھاتے ہوئے
انہیں جلا کے منڈیروں کی اوٹ میں رکھ دو
ہوائیں دیکھ رہی ہیں دیے جلاتے ہوئے
بنامِ عشق گزاری ہے زندگی ہم نے
کبھی چراغ کبھی روشنی بناتے ہوئے
نہ پوچھ کتنی اذیت سے تجھ تلک پہنچے
ہم اپنے ساتھ ترے سلسلے ملاتے ہوئے
تمہارے نام کی مالا بھی جپنے لگتا ہے
کہانی کار مری داستاں سناتے ہوئے
دروں کے شور کو ہم نے دبا لیا شاہد
کسی کے نقش کو اپنا نشاں بتاتے ہوئے

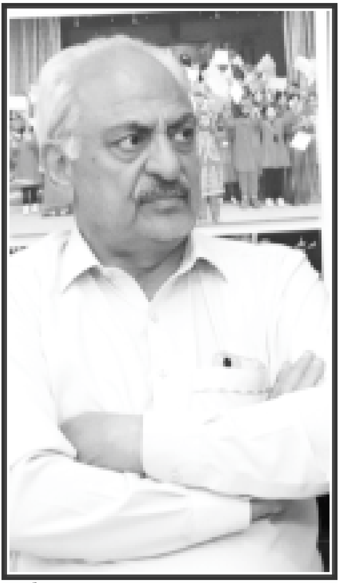

افتخار شاہد

راستے ہموار ہونے لگ گئے
آر والے پار ہونے لگ گئے
چارہ گر چارہ گری کرتے ہوئے
آپ ہی بیمار ہونے لگ گئے
قربتیں اب بوجھ بننے لگ گئیں
سلسلے آزار ہونے لگ گئے
ہجر ماری دھوپ کے پالے ہوئے
پیڑ سایہ دار ہونے لگ گئے
جیسے جیسے فاصلے مٹنے لگے
تیر بھی تلوار ہونے لگ گئے
دشمنوں کو یوں کمک ملنے لگی
دوستوں کے وار ہونے لگ گئے
آپ ٹھہرے دو گھڑی کے واسطے
دشت لالہ زار ہونے لگ گئے
اس نے پہلی بار چائے پیش کی
ذائقے بیدار ہونے لگنے لگ گئے

غزل

توثیقِ عدم کی رہگزر ہوں
تائیدِ وجود کا سفر ہوں

ماضی کی صدائیں گر رہی ہیں
ویرانی میں بولتا کھنڈر ہوں

کہتی ہیں یہ زندگی کی شاخیں
میں اپنی خطاؤں کا ثمر ہوں

تعبیر ہوں یا کبھی تمنا
ہر خواب کا حیطۂ اثر ہوں

اک خوف کی ہوں میں پیش گوئی
اک عہدِ ملال کی خبر ہوں

مقبول کوئی دعا ہوئی ہے
تجدیدِ نصیب کا اثر ہوں

فن کار ہوں اپنے ہر جہاں کا
دنیائے ہنر میں بے ہنر ہوں

دیکھو گے تو داستاں لگوں گا
سمجھو تو میں قصہ مختصر ہوں

لفظوں کے ملے ہیں گھر مقفل
میں شہرِ گماں میں در بدر ہوں

فولادِ خودی میں جو ڈھلی ہے
شمشیرِ انا ! میں وہ سپر ہوں

پھل دیتا ہوں صبر اور رضا کے
ہر رُت میں ہرا بھرا شجر ہوں

افتخار الحق

غزل

میں اپنے جینے سے خوش بھی ہوں؟، یہ اہم نہیں ہے
پر آج تک مسکرا رہا ہوں، یہ کم نہیں ہے

یہاں سے چپ چاپ، جو بھی آیا، گذر گیا وہ
مرے خطِ رہگذار میں زیر و بم نہیں ہے

طواف کرنے لگے یہاں روز اب پرندے
یہ دانہ پانی ہے! میرا آنگن حرم نہیں ہے

بخیل ہے وہ، مگر وہ در چھوٹتا نہیں اب
تو پھر یہ کیا ہے اگر یہ اس کا کرم نہیں ہے

مرے رکوع و سجود کی تمکنت تو دیکھو
جھکا ہوا سر ضرور ہے، پشت خم نہیں ہے

میں جانتا ہوں کہ میں غموں سے اٹا ہوا ہوں
مگر غنیمت ہے یہ، مجھے اس کا غم نہیں ہے

تم اپنے خوابوں کو میری آنکھوں سے مت بناؤ
یہ ایک جھلسی زمین ہے اس میں نم نہیں ہے

میں اس کے ہر اک ستم سے یہ کہہ کے بچ گیا ہوں
ستم نہیں ہے ستم نہیں ستم نہیں ہے

تمھیں پہنچنا پڑے گا خود ڈھونڈھ کر مرا دل
یہاں تمھاری مدد کو نقشِ قدم نہیں ہے

انیم قاری جو سانس لینے کو رک گیا ہے
تو پھر سمجھ لے کہ تیرے لکھنے میں دم نہیں ہے

ابوطالب انیم

غزل

ڈھونڈ لائے نہ میرا سایا مجھے
روشنی میں اگر چھپایا مجھے

چاک پر خاک میں ملایا مجھے
پھر ترے خواب سے بنایا مجھے

یاد آیا مجھے وہ زہرہ جمال
یاد بھی روشنی سے آیا مجھے

چاک پر آنچ کم رہی ہوگی
آتشِ ہجر میں جلایا مجھے

کتنی مصروفیت ہے دفتر میں
ٹھنڈی چائے سے یاد آیا مجھے

وصل سے وصل تک جدا رکھا
خواب سے خواب تک جگایا مجھے

انتہائی قریب کا اک کام
دُور جا کے جو یاد آیا مجھے

پارک اور ریستوران خالی تھے
تُو نے جب خواب میں بُلایا مجھے

میرے والد نے صبر سکھلایا
گریہ تو عشق نے سکھایا مجھے

ماں نے رکھا تھا خواب بستے میں
توڑ کر وقت نے دکھایا مجھے

میں نے دریا میں تیرنا سیکھا
ڈوبنا اشک نے سکھایا مجھے

تجھ سے کیسا گِلہ کہ تیرگی میں
چھوڑ جاتا ہے میرا سایا مجھے

مجھ کو اپنی غزل سمجھ کے سلیم
اُس نے اردو میں گنگنایا مجھے

دل لگایا نہیں گیا ساگر
مل گیا تھا لگا لگایا مجھے

محمد سلیم ساگر

غزل

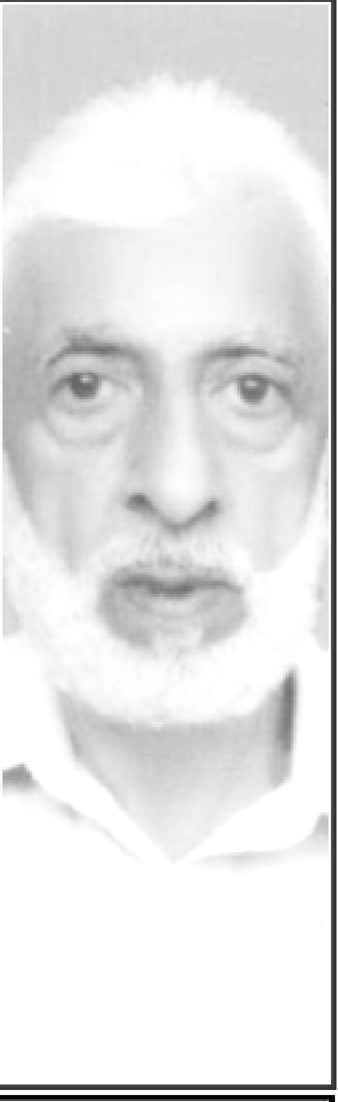

ذہنوں میں سائے خوف کے ایسے اُتر گئے
دھڑکا اگر یہ دل بھی تو ہم لوگ ڈر گئے

کاسے میں نفرتوں کے سوا کچھ نہیں گرا
ہم مانگنے خلوص جہاں جس نگر گئے

وہ دن بھی تھے کمال کے فصلِ بہار تھی
یہ دن بھی ہیں کمال کے دل سے اُتر گئے

آئیں ہزار آندھیاں رستے کو روکنے
پنچھی مرے خیال کے کرتے سفر گئے

رخصت ہوئے جہان سے ہم ہو کے اجنبی
لیکن کہانی عشق کی تکمیل کر گئے

ہے سانحہ یہ میرے زمانے کا کیا کروں
زندہ وہ لگ رہے ہیں جو اندر سے مر گئے

شاہد بچھڑ کے ہم سے وہ ایسے گیا کہ پھر
شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے پتے بکھر گئے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

خوں اپنا پلانا ہے اور خوب پلانا ہے
اے تشنہ لبی تیرا ہر قرض چکانا ہے

اب موت یقینی ہے اس جبرِ مسلسل کی
وہ اس کا زمانہ تھا یہ میرا زمانہ ہے

اک چہرہ بناؤں گا میں لوحِ تمنا پر
پھر لوحِ تمنا سے اک چہرہ مٹانا ہے

اک عمر کی سوچوں نے تخلیق کیا جس کو
چھوٹی سی کہانی ہے چھوٹا سا فسانہ ہے

دل کی بھی لہو نہریں گرتی ہیں یہیں آکر
یہ آنکھ دہانہ بھی دریا کا دہانہ ہے

یہ شام کا منظر بھی ہے کتنا عجب آصف
بجھتی ہوئی آنکھوں میں سورج کا زمانہ ہے

شفیق آصف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فن کی اپنی موج دکھوں کی اپنی رو
اک ترکش میں کوئی کتنے خدنگ بھرے

غزل

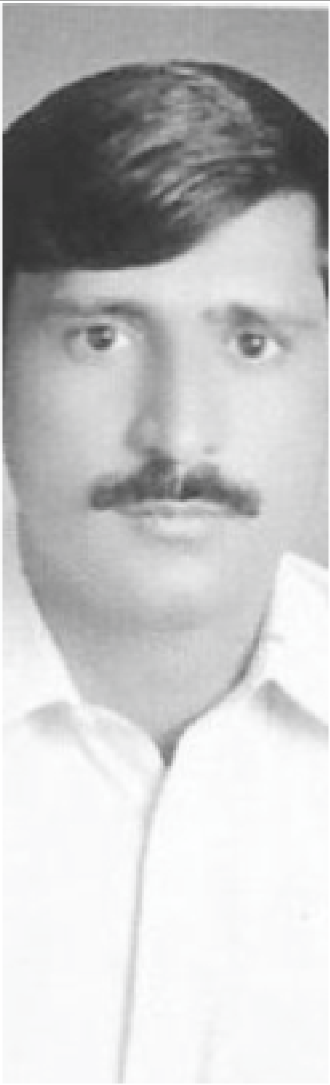

وصل والوں کے میاں ہوش ٹھکانے لگ جائیں
کیوں نہ اب ہجر میں ہم ناچنے گانے لگ جائیں

تو نے اے دوست کبھی ہم سے کہا بھی تو نہیں
اشک تو اشک ہیں ہم خون بہانے لگ جائیں

تب میں سمجھوں گا کوئی عشق کیا ہے میں نے
گر محلے کے مجھے لڑکے ستانے لگ جائیں

بعد میں بھی تو یہی کام کیا جائے گا
کیوں نہ اے دوست ابھی خاک اڑانے لگ جائیں

یہ بھی ڈر ہے کہ میں پھر اور کہیں کا نہ رہوں
روٹھ تو جاؤں اگر یار منانے لگ جائیں

ہم کہ شاعر ہیں ہمیں اتنی سہولت ہے میاں
ہم تجھے کچھ نہ سہی شعر سنانے لگ جائیں

آج کل اوج پہ ہے میرا مقدر دانش
یہ نہ ہو وہ مری تصویر بنانے لگ جائیں

اعجاز دانش

غزل

فلک پہ شک ہے، زمیں پر مجھے بھروسا نہیں
بچھڑنے والے پلٹ آئیں، ایسا ہوگا نہیں

تباہ کچھ نہیں ہوتا، بدلتا رہتا ہے
یہاں ہمیشہ ہے سب کچھ مگر بھروسہ نہیں

ہوا سے بڑھ کے میں بے جستجو ہوں تیرے بغیر
مرا تو پھول کی آغوش بھی ٹھکانا نہیں

بلند تر ہوں سکوت عبادت شب سے
غم نجات نہیں، آرزوئے دنیا نہیں

یہ جھوٹ ہے کہ پرندوں سے عشق ہے مجھ کو
ہمائے شہرت و ثروت کوئی پرندہ نہیں

میں تنہا تر ہوں سکوت خیال یار سے بھی
مرے قریب کسی بوھڑ کا بھی سایا نہیں

متاع زیست بڑھی جتنی، اتنا تنگ ہوا
یہ دل کسی کی مصیبت پہ اب دھڑکتا نہیں

مدد تو دور، جو مظلوم کو کہیں دیکھوں
میں ایک پل کے لیے بھی وہاں ٹھہرتا نہیں

میں پھر رہا ہوں مقام شرف پہ اتراتا
جہان جس کا حقیقت میں مثل ذرہ نہیں

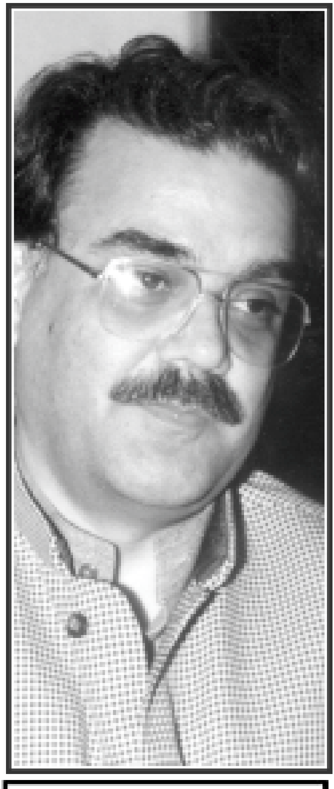

شاہنواز زیدی

غزلیں

شوکت محمود شوکت

راستے ویران تھے اور ہم سفر کوئی نہ تھا
سوئے منزل چل رہے تھے، دل میں ڈر کوئی نہ تھا

آبلہ پا تھے اگرچہ رہ روانِ شوق، پر
مل گئی منزل تو پھر رنجِ سفر کوئی نہ تھا

پوچھتے رہتے تھے اپنے اور پرائے حالِ دل
سچ کہوں تو حالِ دل سے بے خبر کوئی نہ تھا

زندگی، ان رونقوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے اب
شہر میں جب قہقہوں سے خالی گھر کوئی نہ تھا

یوں کھلے تھے ہر کسی پر، سلسلہ ہائے معاش
بہرِ رزق و آب و دانہ، دربدر کوئی نہ تھا

چاندنی بھی چاند کی لگتی تھی تب یکسر، اداس
دشتِ دل میں جب مکیں، رشکِ قمر کوئی نہ تھا

اس کی وہ معجز بیانی آج تک بھولا نہیں
لفظ جو بھی منہ سے نکلا، بے اثر کوئی نہ تھا

کیا زمانہ تھا کہ باتیں دوبدو ہوتی تھیں روز
جب کوئی قاصد نہیں تھا، نامہ بر کوئی نہ تھا

پاؤں سے کچھ یوں سفر باندھے گئے تھے عشق میں
زیرِ پائے شوقِ شوکت، مستقر کوئی نہ تھا

دردِ جگر کی بات نہ کر؟ چشمِ نم نہ پوچھ
کیا کیا ہوئے ہیں عشق میں جور و ستم نہ پوچھ

مے سے غرض ہے ساقی ہمیں اوک ہی سے دے
جامِ سفال خوب ہے یا جامِ جم نہ پوچھ

کیا تذکرہ ہو گردشِ لیل و نہار کا
برسا ہے کتنی بار یہاں ابرِ غم نہ پوچھ

چھیڑا تھا کس نے قصہ، محبت کا رات کو
کیوں کر مریضِ عشق کا نکلا ہے دم نہ پوچھ

ایسا نہ ہو، زبان پہ تیرا ہی نام آئے
چہرہ ہے زرد کیوں؟ تجھے میری قسم نہ پوچھ

غیروں کی سازشوں میں، عدو کے فریب میں
اپنوں کے بھی شریک ہیں کتنے کرم نہ پوچھ

دیکھا تھا آدھی رات کو جو چودھویں کا چاند
شوکت تو بحرِ قلب کے وہ زیر و بم نہ پوچھ

غزل

کیا کہیں کہ آندھی میں کیسے، کتنے گھر ٹوٹے
گھونسلے پرندوں کے تتلیوں کے پر ٹوٹے

گرد باد نے گھیرا پھر غریب بستی کو
کچھ مکاں اِدھر بکھرے کچھ مکاں اُدھر ٹوٹے

ناز میں جسے پالا، حُسن میں جسے ڈھالا
غم پہاڑ جیسے پھر ایک جان پر ٹوٹے

موسم بہاراں میں نہر کے کناروں پر
کتنے پختہ تھے وعدے بعد میں مگر ٹوٹے

مرحلہ وہ آجائے چاہتوں کی منزل میں
دید کی تمنا میں موت کا بھی ڈر ٹوٹے

سلسلے وفاؤں کے ہم نبھانے نکلے تھے
اُس سے بھی سوا جوڑے جتنے عمر بھر ٹوٹے

رہنما اگر چاہیں پانیوں کو بند باندھیں
کیوں کسی کی چھت ٹپکے کیوں کسی کا در ٹوٹے

زخم بھی ہرا ہوگا، درد بھی رضا ہوگا
چاہے میرے گلشن میں شاخ بے ثمر ٹوٹے

رضا اللہ حیدر

غزل

محبتوں کا نیا ایک باب لکھنا ہے
تمھارے نام کا پھر انتساب لکھنا ہے

ترے جمال کو جب ماہتاب لکھنا ہے
ترے جلال کو پھر آفتاب لکھنا ہے

تمھارے پیار میں مجھ کو کتاب لکھنی ہے
تمھارے پیار کو پھر بے حساب لکھنا ہے

میں اپنے دل سے ذرا پوچھ لوں وہ کیا چاہے؟
پھر اس کے بعد ترا انتخاب لکھنا ہے

تمھاری یاد کا دکھ روز مجھ کو تڑپائے
سو اپنی آنکھ کو اب زیرِ آب لکھنا ہے

ہزاروں رنج والم آنسوؤں کی سوغاتیں
متاعِ عشق کا لُبِّ لُباب لکھنا ہے

تمھیں میں ہنستے ہوئے پھول جیسی لگتی ہوں
ہنسی کو اپنی کیا، کھلتا گلاب لکھنا ہے؟

اگر میں کہنا بھی چاہوں تو تم سے کہہ نہ سکوں
حیا لکھوں میں اسے یا حجاب لکھنا ہے

خدائے پاک سے تعبیر اچھی مانگ کے پھر
تمھارے نام کا آنکھوں میں خواب لکھنا ہے

میں کیسے لکھوں گی افروز شوقِ نظارہ
وجاہتوں کو تری لاجواب لکھنا ہے

افروز رضوی

غزل

زمیں تو کیا فلک کو بھی ابھی تسخیر کرنا ہے
مجھے دیکھے ہوئے ہر خواب کو تعبیر کرنا ہے

تحرک دے کے لہروں کو کیا پہلے بپا طوفاں
اب اس بپھرے سمندر پر مکاں تعمیر کرنا ہے

بھلا سوچیں تو کیا سوچیں، بھلا سمجھیں تو کیا سمجھیں
ہمیں تو بس بحکمِ کاتبِ تقدیر کرنا ہے

خبر میں ڈھالنا ہے اب مجھے گمنام اُلفت کو
پھر اس کے بعد اس کی چار سو تشہیر کرنا ہے

زمیں سنولا گئی ہے اب تو اپنے کالے کرموں سے
اِسے مثلِ مہ و انجم ہمیں تنویر کرنا ہے

نواحی بستیوں کو روند کر مٹی بنا ڈالا
انہیں بھی آپ نے کیا شاملِ جاگیر کرنا ہے

بنے گی آگے جا کر جو کبھی تاریخ کا حصہ
وہ ساری داستاں ہم کو ابھی تسطیر کرنا ہے

محبت اب نہیں کرنا، پریشاں اب نہیں رہنا
نہیں بارِ دگر ایسی کوئی تقصیر کرنا ہے

خالدہ انور

غزل

خوف سا روح میں سرایت ہے
لب پہ ہر لمحہ ایک آیت ہے

آپ سے ہم کو جو بھی ہے نسبت
جو بھی جذبہ ہے، وہ نہایت ہے

پھول بھیجے ہیں ڈاک سے اکثر
بندہ پرور بڑی عنایت ہے

اس قیامت سے کیا سبق سیکھیں
اس میں پوشیدہ کیا ہدایت ہے

یاد آتے ہیں وہ، جو اپنے ہوں
کچھ کتابوں میں بھی روایت ہے

سرد مہری سے انکشاف ہوا
آپ کو ہم سے کچھ شکایت ہے

شہر بازار آرزو میں کہیں
کیا غریبوں کو کچھ رعایت ہے؟

اُن سے ملنے کو چاہتا تھا جی
وہ سمجھتے تھے غرض و غایت ہے

رخشندہ نوید

غزل

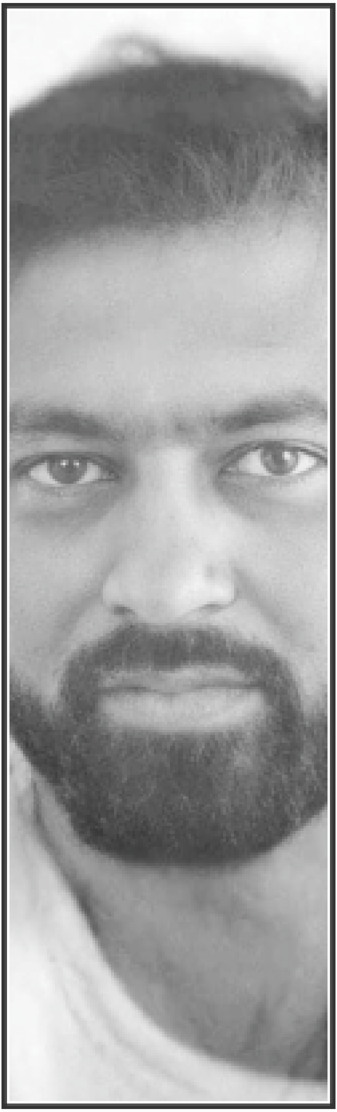

دل کو روشن خیال میں نے کیا
ہجر کو بے مثال میں نے کیا

روز دیوار ٹوٹ جاتی تھی
ایک دن اک کمال میں نے کیا

اپنے ہونے سے کرکے صرف نظر
اہتمام وصال میں نے کیا

حال بے حال ہوگیا سب کا
رقص کو جب دھمال میں نے کیا

آپ کے روبرو سر محفل
خود کو بھی پائمال میں نے کیا

پھر اسے خواب میں ملا کل رات
ربط کو پھر بحال میں نے کیا

راگ کو راگنی کیا میں نے
دادرا تین تال میں نے کیا

ہوگیا بے خیال میں عاصم
اس کا اتنا خیال میں نے کیا

عاصم اعجاز

غزل

کیا وہ ذکر ترا، تسمیہ ہی بھول گیا
میں ابتدا میں کہیں، انتہا ہی بھول گیا

عجیب بھول بُھلیوں میں تھا جو عکسِ حیات
خدا کی ذات کا یہ آئینہ ہی بھول گیا

کبھی تو جان کے میں نے گرا دیے مصرعے
ردیف یاد رکھی، قافیہ ہی بھول گیا

ترے ہی عشق نے بخشی شعور کی دولت
میں عہدِ ماضی کا ہر واقعہ ہی بھول گیا

تری نگاہ نے ایسا حصار کھینچا ہے
میں اپنے گرد لگا دائرہ ہی بھول گیا

وہ اک نگاہِ کرم تھی جھلک نہیں تھی فقط
مریضِ عشق ہر اک، عارضہ ہی بھول گیا

کھلا جو مجھ پہ حقیقت کا در محبت میں
رہِ وفا کا ہر اک معرفہ ہی بھول گیا

جسے جلا کے رکھا عمر بھر سرِ محفل
بجھانا دن کو وہی قمقمہ ہی بھول گیا

یہ کیا طلسم تھا، خیرہ نگاہ تھی میری
سلوک و ضبط کا ہر ضابطہ ہی بھول گیا

حسینؑ سے نہ کیا، جس نے عشق وہ احمد
تمام فلسفۂ کربلا ہی بھول گیا

علی رضا احمد

غزل

آنکھیں ہیں پہ کب دیکھ رہے ہیں یارو
ظاہر میں جو سب دیکھ رہے ہیں یارو

پہلے کہاں جچتے تھے نظر میں ان کی
حیرت سے جو اب دیکھ رہے ہیں یارو

کب کام کی تحسین ہے اس دنیا میں
سب نام و نسب دیکھ رہے ہیں یارو

بیتاب ہیں جو شعر میں ڈھلنے کے لیے
وہ چشم وہ لب دیکھ رہے ہیں یارو

پھرتا ہے نگاہوں میں کوئی موہنا رخ
زندہ ہیں، سبب دیکھ رہے ہیں یارو

آگاہی ملی ایسی کہ ہم سوچتے ہیں
ہم کور تھے، اب دیکھ رہے ہیں یارو

کیا دن کے نکلنے کی کوئی آس نہیں
عریانئ شب دیکھ رہے ہیں یارو

واصف سجاد

غزل

مجھے یقین ہے ہوگی نہیں شکست کبھی
لگا کے دیکھ لو اک نعرۂ الست کبھی

فلک بشر کے لیے دو قدم کی دوری ہے
دکھاؤں گا میں زمیں سے لگا کے جست کبھی

معاف کر دوں گا اپنے سبھی حریفوں کو
بنا جو اپنے قبیلے کا سرپرست کبھی

حیات فکر کی سانسوں سے منسلک ہے اگر
نہیں ہوا ہوں تفکر سے تنگ دست کبھی

خیال و خد کو سنواروں گا دیکھ کر خود کو
نظر تو آئے کوئی آئنہ بدست کبھی

یہ کم شناس کسی کو بھی رد نہیں کرتا
اُٹھا کے لے گیا ناصح تو بادہ مست کبھی

یہ زندگی کہ گزرنا نصیب ہے جس کا
کبھی تو کھا کے گزاری ہے فاقہ مست کبھی

یہ عابدی بھی عجب مخمصے میں زندہ ہے
کبھی ہے منکر ہستی خدا پرست کبھی

علی حسین عابدی

غزل

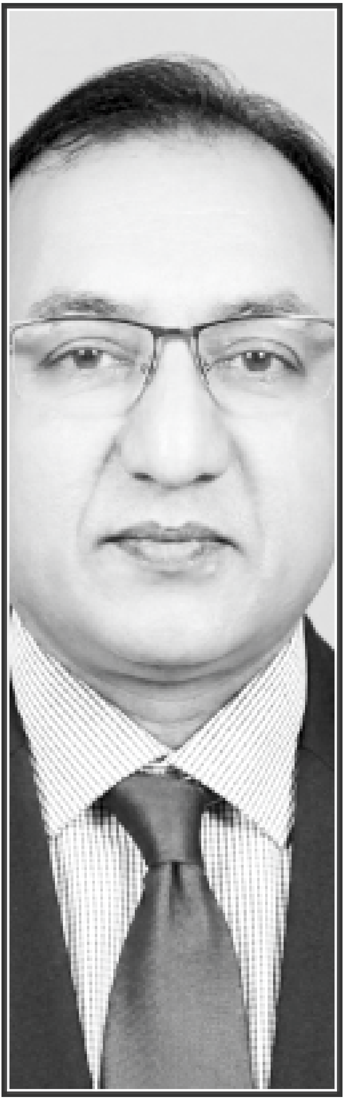

اتنی آوازوں میں پختہ، کون سی آواز ہے
جو ترو تازہ ہے یارو! بس وہی آواز ہے

میں بھی چپ ہوں اور کتابیں بھی مری خاموش ہیں
میرے کمرے میں در و دیوار کی آواز ہے

قوتِ تخلیق کی ہوتی ہے غم سے پرورش
تُو نہیں تو میرے لفظوں میں تری آواز ہے

اپنا مقصد اک اشارے سے یہ سمجھا دیتی ہے
آنکھ میں موجود ہے جو روشنی، آواز ہے

بھیڑ میں بھی شور مدھم پڑ گیا ہے، کیا کریں
دل کے خانوں میں اُسی کی گونجتی آواز ہے

رونما ہونے کی کوشش میں ہے ساری کائنات
ہلکی ہلکی میرے کانوں میں کوئی آواز ہے

اک جگہ رکنا تو ممکن ہی نہیں لگتا ظہور
پھیلتی جاتی ہے ہر سُو، زندگی آواز ہے

ظہور چوہان

غزل

خواب آنکھوں میں جب نہیں موجود
نیند کا بھی سبب نہیں موجود

دل پہ یادوں کا ایک کوہِ گراں
پہلے ہوتا تھا، اب نہیں موجود

جینا مرنا سب ایک جیسا ہے
اب تو کچھ بھی عجب نہیں موجود

میں یوں اکتا گیا محبت سے
دل میں تیری طلب نہیں موجود

اِتنا لاچار ہوں کہ چہرے پر
کوئی غیض و غضب نہیں موجود

ہے فقط نام وہ بھی سادہ سا
کچھ خطاب و لقب نہیں موجود

دینِ الفت کو ایسے پھیلاؤ
گویا کہ بو لہب نہیں موجود

بوسے پھیلے ہیں کچھ فضاؤں میں
جو سمیٹیں وہ لب نہیں موجود

خود کو جو معتبر سمجھتے ہیں
اُن کا نام و نسب نہیں موجود

پوچھیے مت کہ اہلِ دانش میں
نام کو بھی ادب نہیں موجود

صاحبانِ قلم میں بھی دیکھا
بات کرنے کا ڈھب نہیں موجود

ظلم ڈھاتے ہو یوں غریبوں پر
گویا دُنیا میں رب نہیں موجود

دوستوں نے بھی کہہ دیا اشرف
دل میں تیری طلب نہیں موجود

اشرف نقوی

غزل

زیرِ محراب بھیگتے تھے
دھوپ کے خواب بھیگتے تھے

جامنی چھتریوں کے نیچے
آموں کے خواب بھیگتے تھے

گھونگھے جو ریت پر پڑے ہیں
کیا تہہِ آب بھیگتے تھے؟

دیکھا دریائی گھوڑے بھی واں
وقفِ آداب بھیگتے تھے

ہونٹ اخروٹ بارشوں میں
ہو کے بیتاب بھیگتے تھے

آنکھوں اور نیند میں تھا جھگڑا
خواب در خواب بھیگتے تھے

بھیگتے کاش ہم بھی ویسے
جیسے سرخاب بھیگتے تھے

اپنے ہی آنسوؤں کے جل میں
اُن کے سُرخاب بھیگتے تھے

خواہش ابر کے نشے میں
مرمریں خواب بھیگتے تھے

رقصِ ماہی میں ریچھ جلتے
سطحِ برفاب بھیگتے تھے

وائلن پر سفر کی دُھن تھی
گیت نایاب بھیگتے تھے

تنویر قاضی

غزل

فیصلہ ہو گا جانچنے کے بعد
صورتحال دیکھنے کے بعد

ساتھ چلنا ہے یا نہیں چلنا
میں بتاؤں گا سوچنے کے بعد

مجھ کو پہلے ہی تھا یقیں اس کا
لوٹ آئے گا روٹھنے کے بعد

تب کہیں اِس کا مجھ پہ بھید کھلا
زندگانی گزارنے کے بعد

انطباعِ کتاب کر دینا
دل کی تحریر چھانٹنے کے بعد

تب کہیں جا کے ہوش آیا ہے
غم کو خوشیوں میں ڈھالنے کے بعد

رات بھر محوِ انتظار رہا
انتظار اس کا جاگنے کے بعد

خوش ہوا دل وہ مسکرا تو دیے
ہم پہ غصہ نکالنے کے بعد

ہو گیا پھر سے اُستوار امام
رابطہ اُس سے ٹوٹنے کے بعد

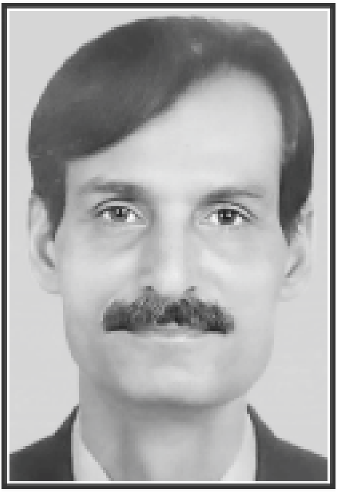

مظہر امام

غزل

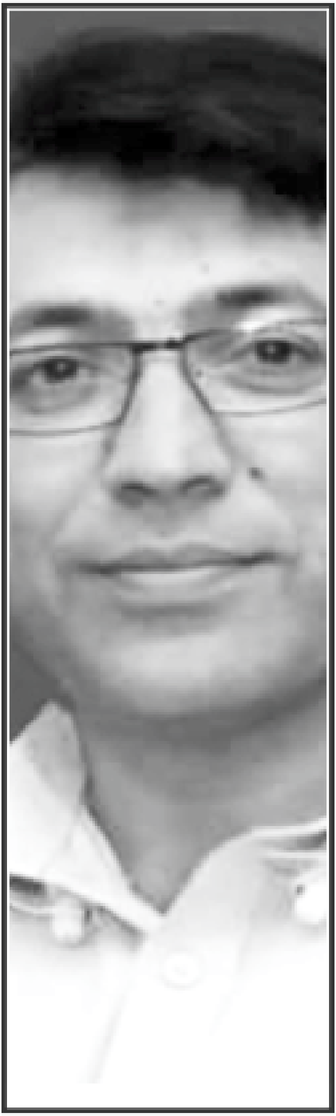

بچھڑتے وقت اسے حوصلہ دلاتے ہوئے
میں چیخ چیخ کے رویا تھا مسکراتے ہوئے

سرکتی گاڑی کی کھڑکی میں وہ بھی تکتا رہا
بکھر رہا تھا ادھر ہاتھ میں ہلاتے ہوئے

لہو کی قوس قزح آنکھ سے چھلک اٹھی
کسی کے شیشہ بدن کو گلے لگاتے ہوئے

پھر اس کے بعد ان آنکھوں نے سوکھ جانا ہے
نگاہ بھر کے اسے دیکھ لے تو جاتے ہوئے

جو اشک میں نے پیے تھے چھلک گئے آخر
وہ رو پڑا مجھے میری غزل سناتے ہوئے

اس ایک رات کا ملبہ تھا اس قدر عابد
گزر رہے ہیں مرے دن اسے اٹھاتے ہوئے

عابد خان عابد

غزل

جو بھی میرا ہے وہ نہیں میرا
ہے بھی دنیا میں کچھ کہیں میرا

زندگی جس کے نام کر دی ہے
وہ بھی کرتا نہیں یقیں میرا

خالی ڈھانچہ مجھے ڈراتا ہے
میرے دل میں نہیں مکیں میرا

آنے والے جہان اس کے ہیں
مجھ سے بڑھ کر ہے جانشیں میرا

اور بھی خوب رو ہیں دنیا میں
سب سے بڑھ کر ہے وہ حسیں میرا

سارے تریاق اس پہ قرباں ہوں
ہائے ! وہ مار آستیں میرا

تیرا کیا ہے کہیں بھی بس جائے
جینا مرنا مگر یہیں میرا

جانے کن گھاٹیوں میں جا اترا
خوب صورت وہ مہ جبیں میرا

تُو مرے سامنے نہیں لیکن
پھر بھی تُو دیکھ لے یقیں میرا

ایک دن آ گرے گا یہ مجھ پر
بوجھ اٹھاتی ہے جو زمیں میرا

میرا کیوں کر ہو وہ جسے اصغر
زہر لگتا ہے انگبیں میرا

اصغر علی بلوچ

غزل

دیں گے نئے اُصول کبھی عاشقی کو ہم
زنجیر کر کے دیکھیں گے آوارگی کو ہم

ہر روز دربدر رہے اسناد تھام کر
ڈھونڈا کیے ہزار یہاں نوکری کو ہم

جینے نہ دے گا ہم کو زمانہ کسی طرح
اپنا کے دیکھتے ہیں مگر سادگی کو ہم

سانسوں کا اِضطراب کبھی کم نہ ہو سکا
منظور ہو نہ پائے کبھی زندگی کو ہم

دل اپنے اختیار میں رہتا نہیں کبھی
محسوس کیا کریں تری سنجیدگی کو ہم

دُنیا کی چاروں سمت ہے پھیلی ہوئی نظر
رکھیں کہاں چُھپا کے تری دوستی کو ہم

پھوٹی جو اک کرن شب بے اعتبار میں
دیتے رہے دُعائیں سدا روشنی کو ہم

جس دن ہمیں گزرنا پڑا پُل صراط سے
وردِ زبان بنائیں گے اِس شاعری کو ہم

گزری تمام عمر اسی اِضطراب میں
بھایا نہ کوئی ہم کو نہ بھائے کسی کو ہم

دُنیا کی ہر خوشی پہ ملی دسترس نبیل
محسوس پھر بھی کرتے ہیں تیری کمی کو ہم

نبیل احمد نبیل

غزل

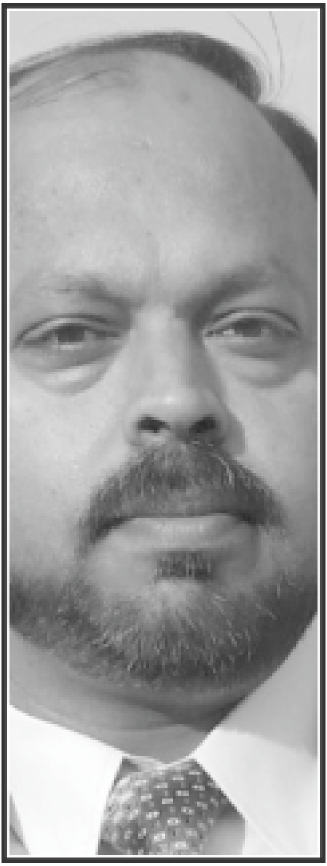

عکسِ خیال ہی سے سلگنے لگی ہے شام
تجھ کو نہ دیکھ کر بھی مچلنے لگی ہے شام

پھر سے کسی صدا نے ستایا ہے اس قدر
آنگن میں دل کے پھر سے برسنے لگی ہے شام

سوئے ہوئے خیال بھی جاگے ہیں دشت میں
تاروں کی اوٹ سے بھی دمکنے لگی ہے شام

خوابوں کے اس سفر میں کوئی ہم سفر نہ تھا
بس اک دیے کی لو میں پگھلنے لگی ہے شام

دیکھا جو آئینے میں تو خود کو نہ پا سکے
اک اجنبی سے ہجر میں جلنے لگی ہے شام

تھک کر میں اپنی ذات میں بہتا چلا گیا
میں تو بکھر گیا یہ سنورنے لگی ہے شام

اویس الحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو ٹھہرے دیوانے بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالد پاگلوں کو گھیرے ہیں

غزل

"وقت کیا چیز ہے خلا کیا ہے"
گر خدا ہے ، اتا پتا کیا ہے

جان آتی ہے کیسے جسموں میں
جان جانے کا سلسلہ کیا ہے

دکھ کی اک لہر سی اٹھی دل میں
درد کے لمس کی دوا کیا ہے

نقش مٹتا نہیں مٹانے سے
جانے اس دل کو ہو گیا کیا ہے

تانے بانے میں زندگی گزری
کیا ادھیڑا گیا ، بُنا کیا ہے

آیئے آپ کو بتاتے ہیں
اس ، محبت کا ضابطہ کیا ہے

پھر اداسی کا طبل بجنے لگا
رونقِ دل کا معاملہ کیا ہے

پوچھیے تو جھلستے پھولوں سے
بادِ صرصر ہے کیا صبا کیا ہے

آپ پر آ گیا ہے دل میرا
دیکھنا کیا ہے سوچنا کیا ہے

بے وفاؤں کو کیسے سمجھائیں
شیشۂ دل کا ٹوٹنا کیا ہے

گر ہو ادراک اپنی قوت کا
کیا مقدر ہے زائچہ کیا ہے

ایک لامختتم مسافت میں
کیا بتائیں کہ آبلہ کیا ہے

رفتہ رفتہ یہ عکس بدلے گا
سامنے آئینہ دھرا کیا ہے

نور کا راستہ تا حدِ فلک
دیکھیے آگے کربلا کیا ہے

شبہ طراز

غزل

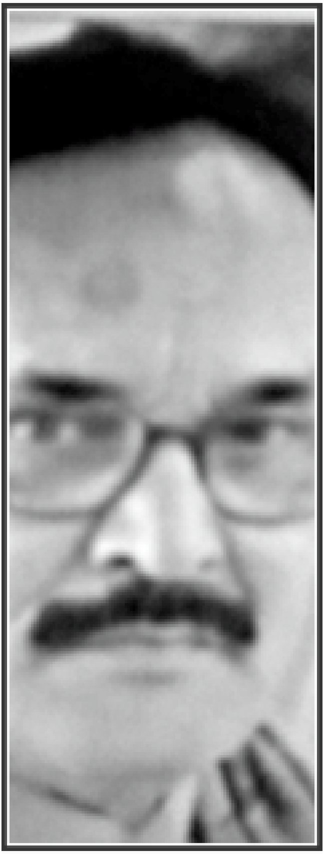

ہر اِک شاخِ تمنا پر یہاں ہے رقص پھولوں کا
چلے آؤ! ہمارے گاؤں میں موسم ہے جھولوں کا

ہوائے شوخ کے جھونکے فضائے دل کش و رنگیں
گلا ایسے میں مت گھونٹو محبت کے اُصولوں کا

اُداسی اور تنہائی بنی ہے جان کی دُشمن
مِرے احساس کا آنگن ہُوا جنگل ببولوں کا

مِلن کے گیت گاؤ آ کے چھیڑو ساز خوشیوں کے
کوئی قِصّہ نہ دہراؤ خطاؤں اور بُھولوں کا

نہیں تُم تو کوئی منظر مجھے اچھا نہیں لگتا
جدھر دیکھوں اُدھر اِک جال سا پھیلا ہے شُولوں کا

چلے آؤ مِرے پردیسی مَیں بھی سج سنور جاؤں
لگا کر ماتھے پر ٹیکا تھکے قدموں کے دُھولوں کا

گزرتا جائے ہے ساون نیاز آزر کوئی کب تک
تمھارا راستہ دیکھے بنا کر ہار پھولوں کا

نیاز جیراجپوری

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

بے کسوں کی طرح ہم بھی ہاتھ مل کر رہ گئے
کیا کہیں خالد، پسِ دیوارِ زنداں کیا ہوا

غزل

فوزیہ تبسم

ہم کیوں نہ کریں عکسِ گلِ زار کی باتیں
قِصّے کبھی گل کے کبھی مہکار کی باتیں

ہر چند زمانے نے ہر اک چیز بُھلا دی
بھولا نہ دِلِ زار تیرے پیار کی باتیں

اُس خواب کی تعبیر اُسی خواب میں ہوگی
جس خواب میں ہوں دیدۂ بیدار کی باتیں

خود اپنے گریباں میں کبھی جھانک نہ پائے
جو لوگ بھی کرتے رہے کردار کی باتیں

جس کام کو کرنا ہے اُسے کر کے دکھا دے
کب تک کوئی سنتا ہے یہ بے کار کی باتیں

آنکھوں میں اُتر آئی ہے اِک خواب سی وادی
جس وقت بھی سنتی ہوں میں اُس یار کی باتیں

غزل

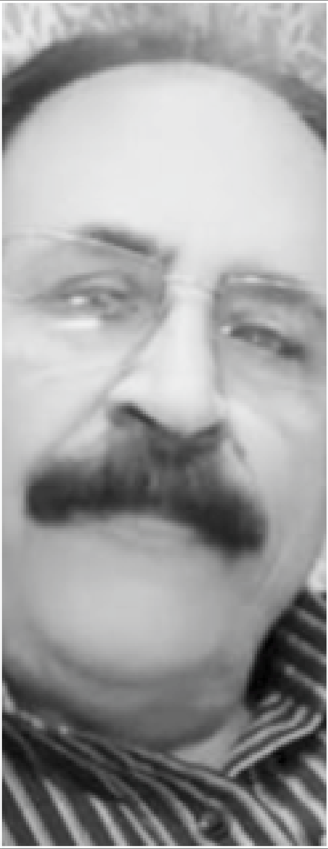

سعید شباب

یہ میرے دل میں ہی کوئی خوشی کی لہر رقصاں ہے
یا تیرے آنے پہ سچ مچ ہوائے شہر رقصاں ہے

فقط اِک پہر کو ٹھہرا تھا آ کر خیمۂ جاں میں
مگر اب تک بدن میں قرب کا وہ پہر رقصاں ہے

وہ کب سے ہاتھ پاؤں دھو کے واپس جا چکا لیکن
ابھی تک لمس کے نشے سے ساری نہر رقصاں ہے

نہ جاں سے مارتا ہے مجھ کو اور نہ جینے دیتا ہے
رگوں میں اب تمہارے پیار کا جو زہر رقصاں ہے

کِسی کے حُسن کے موہوم سے اِک عکس کو پا کر
غزل کے لفظ گاتے ہیں غزل کی بحر رقصاں ہے

شباب اب کے وہ میرے اس قدر نزدیک آیا ہے
زمیں رقصاں، فلک رقصاں ہے سارا دہر رقصاں ہے

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

مقدور سے کچھ بڑھ کے تو مجبور نہ تھا میں
یہ شکر کی منزل تھی ، سو خاموش رہا میں

غزل

وہ جو دل میں چھپ گئیں حسرتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے
نہ لبوں پہ آئیں شکایتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

یہ جو آنکھ میں ہے نمی سی اب، یہ جو درد سا ہے رچا ہوا
نہ سمجھ سکیں گی طبیعتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

ترے بعد جیسے ٹھہر گیا مرے وقت کا کوئی سلسلہ
نہ بدل سکیں یہ روایتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

کوئی خواب ٹوٹ کے رہ گیا، کوئی آس بجھ کے بکھر گئی
یہ جو رہ گئیں سبھی خلوتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

کبھی سوچتا ہوں وہ دن بھی تھے کہ جو تیرے ساتھ گزر گئے
سبھی یاد بن گئیں ساعتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

وہ جو خامشی کا لباس ہے، جو نظر سے مخفی حقیقتیں
نہ کبھی کھلیں یہ حقیقتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

تری یاد جیسے دھواں مرے دل میں آ کے ٹھہر گئی
جو پگھل رہی ہیں یہ ساعتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

کبھی لمس تیرا تھا روشنی، کبھی دوریوں کا ہے سلسلہ
یہ جو بیچ آئیں مسافتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

مرے لفظ لفظ میں درد ہے، تری ہر ادا میں سوال ہے
یہ جو بن گئی ہیں حکایتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

تری اک نظر نے بدل دیا مرے دل کا سارا نظام ہی
یہ جو ہو گئی ہیں بغاوتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

چلیں اب ولی بھی سمجھ گیا ترے قرب کی نہیں جستجو
جو بدل گئیں مری عادتیں کوئی رمز ہے کوئی رمز ہے

شاہ روم خان ولی

غزل

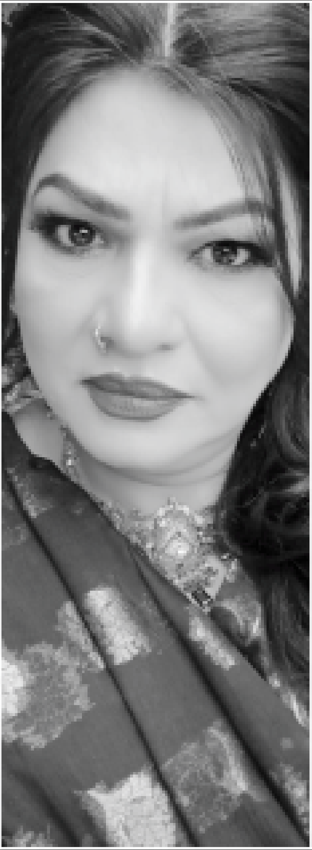

جیا قریشی

پھول کی طرح نکھرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں
زخم جب معجزہ کرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

چیخ بننے نہیں دیتی ہوں میں کوئی سسکی
درد جب حد سے گزرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

مندمل زخم جو ہونا تھا ترے ہاتھوں سے
وقت کے ہاتھ سے بھرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

اس خسارے کو میں ماتم نہیں بننے دیتی
جب کوئی خواب بسرتا ہے تو ہنس دیتی ہے

مُتقاضی ہو توجہ کا کوئی تازہ گلاب
عورتوں سا وہ سنورتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

غم کے میں قرض چکانے کی نہیں ہوں قائل
جب تلافی کوئی کرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

جو ہمیشہ ہی جیا رعب بہت جھاڑتا ہے
میرے غصے سے جو ڈرتا ہے تو ہنس دیتی ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی طرح نہ مرے دل کا قفل کھل پایا
ہوا نہ مجھ سے اِسی ایک درد کا چارا

غزل

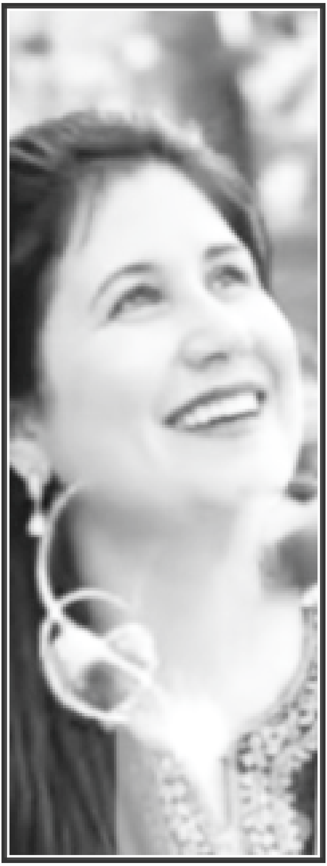

سسکیاں اور آہیں بھرنے کی
مجھ کو خواہش نہیں ہے مرنے کی

عشق تو کھیل ہے جوانوں کا
تجھ کو اب کیا پڑی تھی کرنے کی

جس طرح کی بھی ہوں قبول کرو
مجھ کو عادت نہیں سنورنے کی

جو بھی کہنا ہے کھل کے کہہ دو نا
بات کوئی نہیں ہے ڈرنے کی

حوصلہ گل کہاں سے آئے گا؟
تاب لیکن نہیں مکرنے کی

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیوں تیرے تراشے ہوئے رستوں پہ کھڑے ہیں
اک تیر کہ سب لوگ نشانوں پہ کھڑے ہیں

غزل

میتھیو محسن

جو ایک اوٹ سے جلوہ دکھایا جاتا ہے
ہمارے دل کی تڑپ کو بڑھایا جاتا ہے

کبھی ہیں طوق و سلاسل کبھی ہیں دار و رسن
طرح طرح سے ہمیں آزمایا جاتا ہے

تمھاری یاد کو دل سے بھلا تو دوں لیکن
کہیں یہ شعلہ جلا کر بجھایا جاتا ہے

کوئی ہزار نوازے مگر وہ بات کہاں
جو لطف اُن کی توجہ میں پایا جاتا ہے

میں اُن کو دیکھ کے بس دیکھتا رہوں محسن
کہ دل کی پیاس کو یونہی بجھایا جاتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

غزل

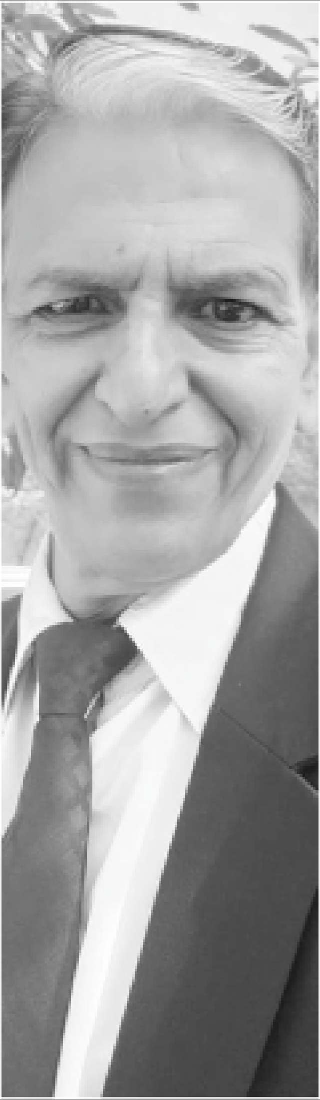

عابد معروف مغل

پہنچا سدا میں جس کی مصیبت کو ٹالنے
موقع ملا تو آ گیا پگڑی اچھالنے

میں جانتا ہوں دوست بھی تالی بجائیں گے
آئے گا کون پاؤں سے کانٹے نکالنے

بستی میں جب کسی سے تری دوستی نہیں
پھر کون آئے گا بتا تجھ کو سنبھالنے

میں نے انا کو مار کے یہ فیصلہ کیا
محنت سے اب فقط مجھے بچے ہیں پالنے

زخمِ جگر لیے ہوئے پھرتا ہوں در بدر
آئے گا کون درد کے رشتے سنبھالنے

عابد یہی ہے رسمِ محبت کی انتہا
وہ پھول چن کے لایا مری رہ میں ڈالنے

غزلیں

ترے خط زندگانی سے نکالے بھی نہیں جاتے
مگر سچ ہے کہ اب مجھ سے سنبھالے بھی نہیں جاتے

اگر چاہوں حقیقت کو عیاں کر دوں زمانے پر
مگر مجھ سے ترے قصے اچھالے بھی نہیں جاتے

اگرچہ اب ترا مجھ سے تعلق بھی نہیں کوئی
مگر اس ذات سے تیرے حوالے بھی نہیں جاتے

لگے ہیں زخم کچھ ایسے محبت کی تمنا میں
کہ آنکھوں میں نئے اب خواب پالے بھی نہیں جاتے

تمہارے قہقہے تو گونجتے ہیں ان فضاؤں میں
مگر لوگوں تلک میرے یہ نالے بھی نہیں جاتے

جدائی بھی نہیں آساں مری تم سے مگر مہدیؔ
کروں میں کیا تمہارے حکم ٹالے بھی نہیں جاتے

غضنفر مہدی

زلفِ برہم وہ جب سنوارے ہے
شہر سارا ہی جان وارے ہے

میری گردن میں ڈال کر بانہیں
یہ اداسی تھکن اتارے ہے

وصل کا اک ادھورا خواب مجھے
عمر بھر کرب سے گزارے ہے

آہ! دشتِ جنوں سے قیس مجھے
چاکِ سینہ لیے پکارے ہے

وصل کی لذتیں وہ کیا جانیں
ہجر تیرا جنہیں نکھارے ہے

میرے اندر کا شخص ہے مہدیؔ
روز مقتل سے وہ گزارے ہے

غزل

عابد رضا

یہ کیا بتاؤں بھلا کون ہوں، کہاں ہوں میں
ابھی تو ہونے، نہ ہونے کے درمیاں ہوں میں

میں اس پڑاؤ پہ پہلے بھی خیمہ زن تھا کبھی
گزرتے وقت کی تقویم میں جہاں ہوں میں

مرے گمان کی وسعت ہزار نوری سال
صدائے کن کی ابد گیر کہکشاں ہوں میں

مثالِ مہر، معیّن مسافتیں ہیں مری
بلیک ہول کی جانب رواں دواں ہوں میں

شبِ سیاہ ہے اور تاک میں ہے گرگِ عدم
مگر وجود کے جنگل میں خوش گماں ہوں میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روئی کے گالوں کی چادر بچھ گئی اس سال بھی
ایسا لگتا ہے کہ یہ بادل بھی بارانی نہیں

غزل

بناوٹی نظر آتا ہے لطف آتا ہے
وہ جب بھی آنکھیں دکھاتا ہے لطف آتا ہے

میں بے سبب بھی کئی بار روٹھ جاتی ہوں
کہ جتنا مجھ کو مناتا ہے لطف آتا ہے

وہ سیدھی بات چھپانے کے واسطے اکثر
ادھر ادھر جو گھماتا ہے لطف آتا ہے

وہ جانتا ہے کہ بے باک ہوں سو شرما کر
نگاہیں جب بھی جھکاتا ہے لطف آتا ہے

گلہ کروں بھی تو کیا اُس کے ظلم کا اُس سے
کہ مجھ کو جتنا رلاتا ہے لطف آتا ہے

نئے نئے سے بہانے بنا کے روز مجھے
گلی میں دیکھنے آتا ہے لطف آتا ہے

میں جانتی ہوں کہ ہم شکل بھی ہیں ہم دونوں
مگر جو کوئی بتاتا ہے لطف آتا ہے

میں اس کو چھیڑ کے اڑ جاتی ہوں فضاؤں میں
ہوا میں تیر چلاتا ہے لطف آتا ہے

وہ میرے جیسا جواں بننے کی لگن میں کرن
جب اپنی عمر چھپاتا ہے لطف آتا ہے

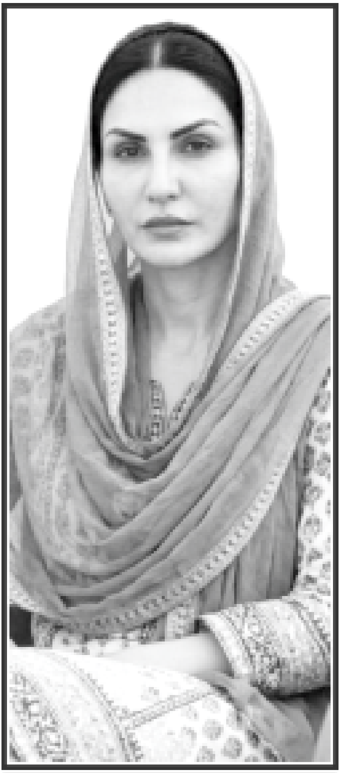

کرن گوندل

غزلیں

کیسے حقِ دشمنی کا ادا ہو سکے
جب نہ گھمسان کا معرکہ ہو سکے

دل پہ سختی نہ کر، دل کو آزاد رکھ
تاکہ یہ عشق میں مبتلا ہو سکے

اس سے نظریں ملا اور ایسے ملا
وہ ترے درد سے آشنا ہو سکے

کیجیے بات کوئی بہاروں سی آپ
زخم دل کا مرے پھر ہرا ہو سکے

رکھیے پیشِ نظر ایسے اپنا مفاد
دوسروں کا بھی تھوڑا بھلا ہو سکے

اس قدر اپنے چہرے کا رکھیے خیال
آئنے کا کہیں سامنا ہو سکے

آدمی کے لیے کب ہے ممکن فصیح
ایک ہی وقت میں دو جگہ ہو سکے

شاہین فصیح ربانی

دھڑکن مری جہاں تھی وہیں ہے رکی ہوئی
گزری ہے ایک تیکھی نظر دیکھتی ہوئی

کیا واقعہ ہوا ہے مرے شہر میں اہم
یکدم ہے گر گئی مری قیمت چڑھی ہوئی

بے ساختہ ہوئی جو اسے دیکھنے کے بعد
اس نے ہے وہ غزل مری دل پر لکھی ہوئی

طوفاں کی دے رہے ہیں خبر گھر گرے ہوئے
کچھ کہہ رہی ہیں دیکھیے شمعیں بجھی ہوئی

میں تو سمجھ رہا تھا کہ تھامے گی میرا ہاتھ
دنیا گزر گئی ہے مجھے روندتی ہوئی

جیسے کہ جاگنا ہی نہیں نیند سے مجھے
یوں فکر مجھ کو خواب میں تعبیر کی ہوئی

برتا غزل میں گرچہ روایت سے انحراف
جدت کے باوجود بڑی سہل سی ہوئی

دو چار کوس بعد ہی منزل نے آ لیا
یعنی کہ ڈھنگ سے نہیں بے رہروی ہوئی

یہ واقعہ خلاف ہے معمول کے فصیح
میں اٹھ گیا تو بزم میں کیوں خامشی ہوئی

غزل

کون یہ ارض و سماوات بدل سکتا ہے
تو مگر طرزِ عنایات بدل سکتا ہے

تلخیاں دل سے بُھلا کر مجھے چاہت سے بُلا
تیرا لہجہ مرے جذبات بدل سکتا ہے

ویسے ممکن نہیں ظلمت سے رہائی لیکن
"چاند چاہے تو مری رات بدل سکتا ہے"

وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے
کب کسی کے کوئی حالات بدل سکتا ہے

بات اتنی ہے کہ ہمت نہیں کرتا انساں
ورنہ دنیا کی روایات بدل سکتا ہے

اویس اکبر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی بھر صرف اسے پوجا مگر گھر بیٹھ کر
پاسدارانِ وفا کا کام دربانی نہیں

غزل

ملا کے ہاتھ کسی سے اگر خوشی نہ ملے
تو ایسے شخص سے بہتر ہے، آدمی نہ ملے

ملے جو سارا جہاں بھی تو رائگاں ہے تلاش
جسے تلاش رہے ہوں اگر وہی نہ ملے

کوئی خدا کے لیے میرے دل کو سمجھائے
ابھی مزاج ہیں برہم، اسے ابھی نہ ملے

وہ انقلاب ہے برپا یہاں کہ ممکن ہے
میں تیرے شہر میں آؤں، تری گلی نہ ملے

بڑا عذاب ہے اس صاحبِ نظر کے لیے
جسے نظر تو ملے ، اور روشنی نہ ملے

میں اس گلی کی طرف جا رہا ہوں دیر کے بعد
نہیں بعید کہ اب کے وہاں کوئی نہ ملے

میں جس کے بعد سمجھنے لگوں خدا خود کو
تو ایسے گیان سے اچھا ہے آگہی نہ ملے

میں ایسی آب و ہوا سے گریزپا ہوں، جہاں
میں سانس لیتا رہوں اور تازگی نہ ملے

مرے خدا تری نعمت کا شکریہ لیکن
سسک سسک کے ہے جینا تو زندگی نہ ملے

علمدار حسین

غزل

یار ٹوٹے ہوئے خوابوں کی وہ تعبیر کے دُکھ
ایک جیسے ہی ہیں پنجاب یا کشمیر کے دکھ

جسم چھلنی کیے جاتے ہیں زمانے والے
تازیانے کہیں تلوار کہیں تیر کے دُکھ

اپنے لوگوں کے گلے کاٹنے والوں سے کہو
عمر بھر سہنا پڑیں گے تمہیں شمشیر کے دُکھ

ایک مدت سے اسے دیکھنے والا نہ ملا
دیکھ دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کے دکھ

جس کو منزل کے نشاں تک نہ میسر آئے
ٹھوکریں کاش سناتی تمہیں رہ گیر کے دکھ

جب تلک قاری کی نظروں میں محبت نہ ملے
اک تذبذب میں پڑے رہتے ہیں تحریر کے دکھ

دل کہ بنگال کے صدمے سے نہ نکلا ارشد
کاش دیکھوں نہ کبھی کوٹلی و دیر کے دُکھ

ارشد محمود ارشد

غزل

مجھے رہنا ہے یونہی نارسا کیا؟
تو اس سے بڑھ کے ہے کوئی سزا کیا؟

میرے پر کاٹ کر سوچوں کے اس نے
مجھے اذنِ رہائی دے دیا کیا؟

تری یادیں ہی میری ہمسفر ہیں
مرا زادِ سفر اس کے سوا کیا؟

ہیں لب خاموش آنکھیں بولتی ہیں
یہ آنکھوں کی زبانی کہہ دیا کیا؟

تجھے دوں پھول سے تشبیہ کیوں کر
تو خود اک پھول ہے تو پھول سا کیا؟

نہ غم خواری کریں گر دوست میری
رقیبوں سے مجھے ہو پھر گلہ کیا؟

اگر جینا ہے تجھ بن خاک جینا
تو پھر اشفاق جینے میں مزا کیا؟

محمد اشفاق بیگ

غزل

مرے درد کی پھر دوا تم بنے
کڑی دھوپ تھی پر گھٹا تم بنے

ہیں منظر نئے میرے چاروں طرف
مرے ہم سفر، ہم نوا تم بنے

تمھاری جو مجھ پر عنایات ہیں
خدا مہرباں ہے دعا تم بنے

یہ دیوانگی بے سبب تو نہیں
میں مخمور ہوں تو نشہ تم بنے

خموشی میں ایسا فسوں ہے کوئی
سُنے جا رہا ہوں صدا تم بنے

جفاؤں کے تپتے ہوئے دشت میں
مثالِ شجر پھر وفا تم بنے

مری کشتیوں کو بھی ساحل ملا
کہ دلشاد جب ناخدا تم بنے

دلشاد رانا

غزل

جلنے لگا ہے اک دیا روز سرِ مزار پھر
آنے لگے یہاں پہ کیا عاشقِ نامدار پھر

فرق تو کچھ پڑا نہیں ترکِ تعلقات سے
رُکنے لگی ہے سانس یہ، دیکھ کے حسنِ یار پھر

حُسن بھی گیت گائے گا رقص کرے گا عشق بھی
صحرا کی خاک چھاننے آئیں گے خاک سار پھر

جیتے رہے تو رونقیں ساری ہی لوٹ آئیں گی
بیٹھیں گے مل کے دیکھنا سارے کے سارے یار پھر

شور ہے ہر طرف بپا آنے کو پھر بہار ہے
دل کے چمن کو لوٹنے آئیں گے کچھ شرار پھر

آتے نہیں وہ یاد اب اِس سے بڑا ہے جھوٹ کیا
چھیڑ دے نغمے مطربا آج ہے دل فگار پھر

جانے لگے وہ جانے دو غیر کا ہاتھ تھام کر
ہونے لگیں تو ہونے دو ہم کو بھی اشکبار پھر

الماس شبی

غزل

نوید عاجز

انسان خواہشات کے دھاروں میں قید ہے
اور زندگی یہ موت کے غاروں میں قید ہے

جنگل کی وحشتوں سے نکل آیا ہے مگر
انسان آج شہر کے غاروں میں قید ہے

پیاسے کے پاس آیا ہے دریا نہ آئے گا
اس کا وجود اپنے کناروں میں قید ہے

دعوائے برتری ہے جسے، جان لو کہ وہ
احساسِ کمتری کے حصاروں میں قید ہے

دل کو نہ دوش دیجیے اس کا قصور کیا
خود آنکھ دل فریب نظاروں میں قید ہے

آزاد ہو گیا ہے جو دشمن کی قید سے
اب مصلحت کے جھوٹے غباروں میں قید ہے

پھرتا ہے دندناتا ہوا جرم شہر میں
انصاف منصفی کے اداروں میں قید ہے

بلبل کھلی فضا میں بھی آزاد کب ہوا
عاجز وہ حسنِ گل کی بہاروں میں قید ہے

غزل

لے گئی وحشتِ دل بُرجِ بیابانی میں
ڈھونڈتا ہوں تجھے افلاک کی ویرانی میں

جام لبریز جو ہو جائے، چھلک جاتا ہے
عشرتِ عشق نہیں حُسن کی عریانی میں

وہ کسی بات پہ ناراض ہوا بیٹھا ہے
قید کر کے مجھے زندانِ پشیمانی میں

اپنی جانباز نگاہوں کو لگا رکھا ہے
جانے کب سے ترے خوابوں کی نگہبانی میں

وہ نہیں مسجد و محراب میں ملنے والا
ڈھونڈنے نکلو اسے دشتِ خراسانی میں

ہو گیا ختم شبِ غم کے اندھیروں کا فسوں
ماہِ بے داغ ہے ایسا تیری پیشانی میں

عشق سے انفس و آفاق کے در ایسے کھلے
پڑ گئی آنکھ مری ورطۂ حیرانی میں

خس و خاشاک کی صورت نہ کہیں بہہ جائیں
ضبط کے ضابطے جذبات کی طغیانی میں

اک محبت ہی زمانے میں ہے قائم دائم
مستقل کچھ بھی نہیں کارگہِ فانی میں

احمد نواز

غزل

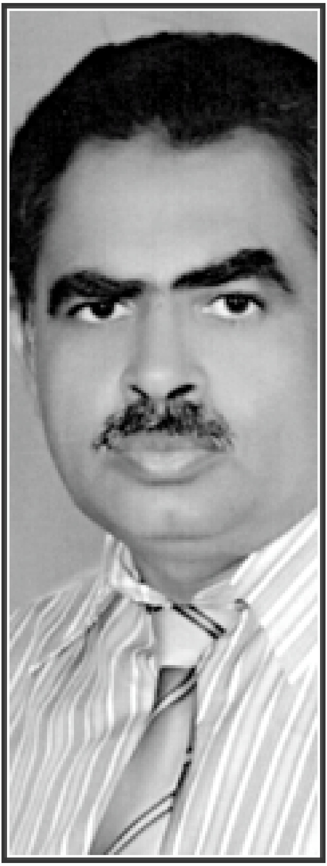

اسلم سحاب ہاشمی

بیٹھ کے شب آنگن میں وہ شرمائے ہیں
چاند ستارے خود کو وارنے آئے ہیں

دن کے چہرے پر ہے سانولی رنگت کیوں
لگتا ہے دو نین کہیں کجرائے ہیں

عمر بتا دیتی ہے ان کی خوشبو میں
آپ نے جو لفظوں کے گل مہکائے ہیں

پاؤں زمیں سے چپک گئے ہیں دیکھو تو
رستوں نے قابوی جال بچھائے ہیں

خوں رستا ہے بھری بہار میں شاخوں سے
منظر کے آئینے سب پتھرائے ہیں

جس رستے پر دھند سحاب ہے خیمہ زن
اس پر ہم منزل کو تلاشنے آئے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

"گداز" کا اندازِ خاص

محسن شکیل نے ادبی سیاست کے جوڑ توڑ سے نہیں اپنی ریاضت اور اپنے اصیل تخلیقی جوہر کے بل پر اردو شاعری کے عصری منظرنامے میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ اس کی شاعری سیدھی نہیں بولان کے پہاڑی راستوں کی طرح ٹیڑھی میڑھی مسافتوں کی مسافر ہے۔ دیکھے اور ان دیکھے منظروں کی کہانی ہے۔ وہ اپنے اس لاشعوری وجودی زاویہ جمال سے آگاہ بھی ہے اور اس نے اس سے جڑے رہنے کو اپنی شعوری ترجیح بھی بنا رکھا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید میں اس کے اس شعر کی گواہی بھی موجود ہے۔

جو ہے تجرید اور ابہام کی تہذیب کا اکھوا
وہ ایسا منفرد لہجہ سخن کے بیچ رکھتا ہے

....

وہ تجرید اور ابہام کے اہتمام بغیر کچھ نہیں کہتا۔ اس کی تجرید ان کہی کے ابلاغ کا وسیلہ بنتی اور اس کا ابہام کوئی بازاری جہت جھلکانے کے بجائے تہہ داری سامانتا ہے۔ محسن شکیل کی شاعری سے مجھے اپنے (مرحوم) دوست سجاد بابر یاد آ جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی تجریدی پیرائے کے شاعر تھے:

میں نے جب دیکھا کہ گلدان میں انگارے ہیں
ہاتھ کے پھول بھی دیوار پہ دے مارے ہیں

مجھے یہ دونوں شاعر ایک دوسرے کے ہمزاد محسوس ہوتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ دونوں کے اندازِ اظہار کا منطقہ بڑی حد تک ایک جیسا ہے مگر دونوں کے فکر و احساس اور نفسی و اجتماعی سروکاروں کی دنیا اپنی اپنی ہے۔

محسن شکیل کے رومان میں تفلسف اور افکار میں ایک خاص طرح کی سرمستی کا عنصر نمایاں ہے۔ مگر فکر ہو کہ رومان، ہر دو اعتبار سے دونوں میں متانت، وقار اور گہرائی کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ مگر محسن شکیل کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی برہمی اور برگشتگی کو بھی تہذیب و شائستگی کے دائرے میں رکھنا جانتا ہے۔ ذاتی و اجتماعی معاملات میں مثبت رویوں کے توسط توازن و سلامت

جلیل عالی

روی کی راہ پر رہنا اس کے لیے اسلوبِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی بیشتر غزلوں میں عام ڈگر سے ہٹی ہوئی زمینوں کا انتخاب کرتا ہے۔ ان میں بظاہر عجب کا تاثر ابھارنے والی بعض ردیفیں بھی اس کے مزاج کی مجموعی ملائمت کے باعث کھردری محسوس نہیں ہوتیں:

"گداز" کی غزلوں سے چند منتخب اشعار اور نظموں سے دو تین اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے نہیں بتائے لیکن سمجھ میں آئے
آنکھوں میں پھیلتے جو خاموش رتجگے تھے

....

میرے پاس محبت ہے ان آنکھوں کو
پہلا خواب دکھانا میرا ممکن ہے

....

ستارے ٹانکتا رہتا ہوں کیا کروں شب بھر
یہ آسمان سجانا ہی مجھ کو پڑتا ہے

....

نمایاں عکس میں ہو جاؤں گا گہرے تحیر کا
ابھی وجدان کی پھیلی ہوئی وسعت کا عرصہ ہوں

....

اک میز پہ رکھی ہوئی کافی میں بجھا لمس
اک شام ملاقات میں دبکی ہوئی یادیں

....

دکھائی دیتے ہیں روشنی میں عجب اندھیرے
بھٹک رہا ہوں عجب اندھیروں میں روشنی سے

....

استعارہ ہوئی حقیقت کے
آئنے میں ظہور کرنا تم

تھا چاند کی طرح تری کھڑکی پہ ضوفگن
سورج نکل کے بام پہ آیا تو میں گیا

....

لرز رہی تھی سماعت کے اندروں کب سے
فغاں جواب لبِ گفتار پر کھلی ہوئی ہے

....

ہوائیں اور شجر اور طائرانِ خیال
اک آسمان ہمارا گواہ تھوڑی ہے

....

ڈوب گئی حرف و معنی کی ناؤ یہاں
تیرا اشک ہمیں تو اک گرداب ہوا

....

رات پہ روشنی پڑی تو لگا
چاندنی سے نہائی عورت ہے

....

کسی کا ہجر ہے درپیش ہم کو
بہت مشکل مگر آسان کتنا

....

ہم اس کے پاس چلے آئے ہیں، نہ ملنے کا
وہ کیا بنائے گا اب کے بہانہ دیکھتے ہیں

....

کہیں یہ توڑ نہ ڈالے تری انا کا طلسم
مرے وجود میں تیرے لیے جو وحشت ہے

....

رستے میں چھاؤں بانٹتے ڈھیروں شجر ملے
پر یہ مرے پڑاؤ کا پیاسا درخت ہے

....

گلوں سے، خواب سے، لہجے کی وضع داری سے
محبتوں کے اشارے بنائے تھے میں نے

....

دور پھیلی ہوئی گہرائی کی
خامشی آن لبی ہے مجھ میں

اپنی وفا جو اپنے ہی لوگوں میں بانٹ دے
میرے حساب سے کوئی فرقہ پرست ہے

....

مورتی لگ رہا تھا پانی کی
اس قدر بھر گیا تھا اشکوں سے

....

آسمانوں تلک نظر آئے
ان زمینوں کے جو کنارے ہیں

....

ہم دھڑکتے تھے دھڑکنیں ساری
آپ کو دل بنانے ہوتے تھے

....

قریب تر تو کوئی بھی نہیں تھی چنگاری
لگی ہے میرے مکانوں میں دور پار سے آگ

اک بستی میں

ایک غزل کے دونوں مصرعے تڑپ رہے ہیں
اور اک نظم بچھڑ کر خود سے
نامعلوم کی جانب اپنی چادر تھامے
پاگل پن کی اک حالت میں
زخمی پیروں بھاگ رہی ہے
اک بائک پر تین صحافی
سگنل توڑ کے آپہنچے ہیں
اور اخبار کے اک پرزے سے
سرخ لہو میں ڈوبے حرف کا
بگڑا چہرہ پونچھ رہے ہیں
(قلم کے پھیلے آنسو)

وہ رونا تھا
آہ و بکا تھی
ٹوٹ پھوٹ کا اک لمحہ تھا
مجھ میں اک تقسیم کا گہرا
دکھ اترا تھا
غم دہکا تھا
میں تجسیم کے
کھو جانے کے
گہرے گھاؤ کا
صدمہ خود میں جھیل رہا تھا
منظر نامے کے پس منظر
آنسو ڈوبا سا منظر تھا
(سنہ 71)

جگ میں عیسیٰ کی آمد سے پہلے
میں نے حوا کو دیکھا حسین حسن پارے میں
صدیوں کے دھارے میں
جمالِ فراواں کے پھیلے ہوئے
وسعتِ بے کراں کے تسلسل بھرے استعارے میں
تاب و تب کے تحیر کے بہتے ہوئے اک کنارے میں
چار سو ان نگاہوں میں موجود سے اک نظارے میں
وہ چلی اپنی سمتوں کے لکھے ہوئے لازمانوں میں
کچی پناہوں میں
کھوئے ہوئے کچھ سرابوں میں
اور ہتھیلی پہ تحریر کردہ لکیروں کے پکے نشانوں میں
(ون ملین ایئرز بی سی)

☆☆☆☆☆

شیخ احمد گجراتی پر ایک تحقیقی شذرہ

مثنوی ''یوسف زلیخا'' میں اُنھوں نے اپنا نام شیخ احمد شریف درج کیا ہے:

جو شیخ احمد شریف اپنی زباں رک (رکھ)
سرن آیا سراون تج ناسک [۱]

....

تاریخی شواہد سے خبر ملتی ہے کہ اُن کا خاندانی نام فضل اللہ تھا اور وہ شاہ وجیہ الدین علوی کے مرید تھے۔ گجرات اُن کا وطن ہونا اُنھی کے ایک شعر سے ثابت ہے:

احمد دکن کے خوباں ہوتیاں ہیں پُر ملاحت
تُو توں دکھن کو اپنا گجرات کر کے سمجھیا

....

سنی العقیدہ، متقی اور پرہیز گار شخص تھے۔ مثنوی ''یوسف زلیخا'' میں اپنی استعداد کا ذکر کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ مَیں حدیث، طب، فقہ، منطق، الٰہیات اور نجوم جیسے علوم کا ماہر ہُوں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اکتسابِ علم میں سالہا سال مصروف رہا اور عالموں سے ایک مدت تک علمِ کلام، صرف و نحو، عروض اور معانی و بیان کے درس لیے۔ وہ کئی زبانوں سے واقف تھے جن میں تلنگی، سنسکرت، فارسی اور عربی شامل ہیں۔ قلی قطب شاہ کے کہنے پر گجرات سے گولکنڈہ آئے لیکن درباری ماحول سے ناواقفیت اور وجہی جیسے شاعر کی موجودگی میں پریشاں خاطر رہے۔ نصیرالدین ہاشمی بھی احمد کو گولکنڈہ کے قطب شاہی دربار کا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور اُن کا زمانہ قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت (۱۵۸۰ء-۱۶۱۲ء) متعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے انھیں وجہی (۱۶۰۰ء-۱۶۵۹ء) سے عمر اور مرتبہ دونوں میں افضل قرار دیا ہے۔

میر نے ''نکات الشعرا'' میں اُنھیں احمدی گجراتی کہہ کر یاد کیا ہے اور بغیر کوئی حالات لکھے پانچ اشعار کی ایک غزل نقل کی ہے۔ اگرچہ اُس زمانے میں اور بعد میں بھی شعرا ''ی'' لگا کر اپنا تخلص لکھا کرتے تھے جیسے سعدی، شعوری جالاپوری، غواصی، فخری، فضلی

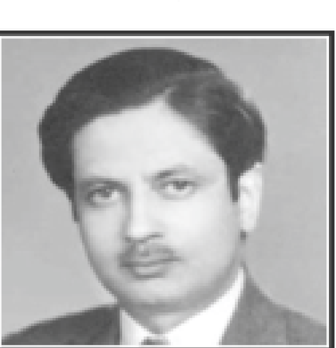

خاور اعجاز

دکنی، لطفی اور ہاشمی وغیرہ لیکن جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ میر کے تذکرے میں کاتب نے اضافت کے بجائے (ی) لکھ دی ہے تاہم میر کے علاوہ شفیق نے بھی انھیں احمدی ہی لکھا ہے جو ممکن ہے میر کے تتبع میں لکھا ہو البتہ قائم، شوق اور میر حسن نے اُنھیں احمد کہا ہے جبکہ حیدر بخش حیدری نے اُن کا نام محمد احمد گجراتی رقم کیا ہے۔

دکن کے مایۂ ناز استادِ سخن تھے۔ اُن کی عظمت کا اعتراف ابنِ نشاطی (م ۱۶۵۵ء) جیسا بلند مرتبت شاعر بھی کرتا ہے:

نہیں اِس وقت پر وو شیخ احمد
سخن کا دیکھتے باندیا سو مُیں سد[۴]

شیخ صاحب کے بارے میں "روضۃ اولیائے بیجاپور" میں "عالم و مدرس اور فقیہہ و محدث" کے الفاظ استعمال ہُوئے ہیں اور نام سے قبل حضرت لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح شمس اللہ قادری بھی اُن کو مُلّا احمد کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ دونوں مثالیں شیخ صاحب کی بزرگی کو ظاہر کرتی ہیں۔

اپنی مثنویوں "یوسف زُلیخا" (۱۵۸۰ء) اور "لیلیٰ مجنوں" کے لیے شہرت رکھتے ہیں جو اُن کے قدرتِ کلام، زورِ بیان اور شاعرانہ کمال کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ اِن مثنویوں کے حوالے سے وسیع مشاہدے اور باریک بینی سے کام لینے والے شاعر نیز سراپا نگاری اور تصویر کشی میں طاق دِکھائی دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ اِن مثنویوں سے اُن کے عہد کی تہذیبی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ برِ صغیر کے رسم و رواج اور معاشرت کی تصویریں اُن کے ہاں جا بجا ملتی ہیں۔

احمد گجراتی کی بالغ نظری مثنویات میں اُن کے بصیرت افروز نکات سے جھلکتی ہے جو قارئین کو ایک نئی آگہی سے مستفید کرتے ہیں اور اپنی نادر تشبیہات کے سبب اثر انگیز ہے اور کلام کو رفعتِ تخیل سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں نئی تراکیب بھی لانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے "دکھ دھوپ" وغیرہ۔ اپنے زمانے کے محاوروں پر بھی اُنھیں عبور حاصل لگتا ہے۔ وہ ہونٹوں میں دل آنا (ہیبت زدہ ہونا)، صبوری پکڑنا (صبر کرنا)، نیند کڑوی کرنا (نیند میں خلل ڈالنا)، آس کاٹنا (نا امید ہونا) جیسے محاورات کو اپنے کلام میں بڑی روانی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں قدامت کے آثار بہت گہرے ہیں لیکن اُن کے تصرفات کو زمانہ مابعد کے شعرا نے بھی برتا ہے جیسے الفاظ کی جمع بنانے کے لیے کتاب سے کتاباں وغیرہ۔

قدیم دکنی ادب میں اُس وقت کی زبان کو ہندی،

ہندوی، گوجری یا گجری کہا گیا ہے جن میں سے احمد نے اپنے لیے ''ہندوی'' کا انتخاب کیا ہے (سو کیتا ابتدا ہندوی زباں سوں)۔ اُن کی اِس ہندوی میں پنجابی، مرہٹی اور سب سے زیادہ برج بھاشا کے اثرات موجود ہیں۔

مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

پہلیں لیُوں اس اللہ کا ناؤں
جو رحمٰن و رحیم اس کی صفت پاؤں

....

اس کے بعد مناجات باری تعالیٰ ہیں:

الٰہی مَیں اگر بھوتیک بُرا ہُوں
تو بھی ہر حال میں بندہ ترا ہُوں

بعد ازاں نعتِ سید المرسلین ہے:

محمد جو رسول اللہ ہے وہ
رسولاں انبیاں کا شاہ ہے وہ

....

پھر صفتِ شبِ معراج اور مدحِ علیؓ کے بعد اپنے مرشد شیخ وجیہ الدین کی تعریف اور اپنے بارے میں چند اشعار درج کرنے کے بعد قلی قطب شاہ کی لمبی تعریف کی گئی ہے۔ اِن معروضات کے بعد کہیں جا کر مختلف سرخیوں اور عنوانات کے تحت یوسف زلیخا کے اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک تو مثنوی کی زبان اِتنی قدیم ہو چکی ہے کہ بآسانی پڑھنا دشوار ہے اور دُوسرے بغیر فرہنگ کے مطالب تک رسائی بھی مشکل ہے۔

احمد نے ہندی میں غزل، قصیدے، عیدنامے اور کبت بھی تحریر کیے۔ اُن کی غزل تصوف سے لے کر قرآنی آیات کے تراجم تک کئی عارفانہ منازل کی نشاندہی کرتی ہے جس سے اُن کا بلند جذبات کا حامل انسان ہونا مترشح ہے تاہم اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں شکایت زمانہ بھی در آئی ہے اور عموماً عشق و عاشقی اور عورتوں سے باتیں کرنے کے مضامین ملتے ہیں۔ اُن کے فرزند شیخ محمد شریف بھی شاعر تھے اور عاجز تخلص کرتے تھے۔ اُن سے ایک مثنوی ''لال و گوہر'' منسوب ہے۔

انتخاب غزلیات احمد گجراتی

میٹھے بچن ترے سُن نابات کر کے سمجھی
شیریں لباں یو تیرے جوں شات کر کے سمجھیا

گالاں اُپر موہن کے بکھرے گئے سو زُلفاں
آب حیات اُوپر ظلمات کر کے سمجھیا

بستاں میں ہے مکلل سر پر ہے زر کا آنچل
جھلکاٹ دیک مکھ کا شبرات کر کے سمجھیا

....

ساجن جب اپنی مہر سے کرنے لگے خطاب
مقدور نئیں کسی کا جو دیوے اُسے جواب

زنجیرِ زُلفِ یار گلے میں کمند ہے
سر کو جھکا دیا ہے مبادا نہ ہو حساب

نہیں بوالہوس کا کام جو جورِ صنم سہے
کب دیکھے آنکھ بھر کے کوئی سُوئے آفتاب

....

عجب گُل پھولتا ہے عشق میں سُن
رُخِ عاشق گہے سُرخ و گہے زرد

کرے ہے صبر دل کو بے قراری
اُٹھے شعلہ جگر سے اور دمِ سرد

....

کچھ دِنوں اور ہے جفا ہم پر
کچھ دِنوں اور ہے بَلا ہم پر

مجبروں نے کری ہے اُس کو خبر
یہ الم نشرح سے کُھلا ہم پر

لوگ کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ
جو کہے خلق سو رَوا ہم پر

خُوش لگے اُس کی یہ ادا احمد
گاہ ہے مہر گہ جفا ہم پر

....

یہ کائنات تمام اُس کے نُور کا ہے ظہور
جو آنکھیں دل کی کُھلیں، ہووے تب عیاں مستور

....

جس کو دیکھ کے کہتا مِرا دل
اُسی کے واسطے پیدا کیا دِل

ہزاروں دل میں کوئی صاحبِ دل
اُسے دل کب کہیں جیسا مِرا دل

مدح ملک ور چھوڑ کر دل میں ہجو کوئی بھائے ہیں
کیا شعر کے مضموں میں ناکارا جت پائے ہیں

لیتے ہزاراں کی متاع ناجان کر اصراف سوں
در عیش و عشرت میں جتا ڈالیاں سوں سب مل کھائے ہیں

کنچن نمن سب تھا سو تن اس کوں نا کر سکیا جتن
پیوستہ قبایاں سوں ہو علت اپس کوں لائے ہیں

نا بولناں تھا شعر یو کوئی دن بھی کیسا آئے گا
ناحق اپس کوں جگ منے بدنام کر دکھلائے ہیں

....

ہُوئے دیدار کے طالب خُودی سے خُود گزر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں، خردشاں بے خبر نکلے

نشانِ بے نشاں ہم ملکِ یکرنگی میں پاتے ہیں
خبر چھوڑی دوئی کا ہم نے جب سے ست نگر نکلے

بھرے دو نین کے جھگڑاں صبوری ساتھ لے توشہ
کمر ہمت سے باندھے ہو پرت کی بات پر نکلے

نین کے ہاتھ کھپرلے پھریں درشن کی بھیکاں کو
نہ پائی ایک در پر بھی بھکاری در بدر نکلے

رہے نادر خیالاں میں ملے شوریدہ حالاں میں
ہُوئے صاحب کمالاں میں، کدھر آ کر کدھر نکلے (۳)

گھنگھٹ جب زرزری مکھ پرتے موہن (ڈال) کر نکلے
مقابل ہوئے نا ہرگز اگر سورِ سحر نکلے

عجب کل رات دھن سوں (مَیں) تو ایک معجزا دیکھا
کہ سارے چاند دو نزل سو یک چولی پھیتر نکلے

چنچل کی جب صفت لکھنے قلم میں ہاتھ تیں لیتا
یکا یک ہاتھ میں میرے قلم ہو نیشکر نکلے

موہن کے غم سوں گل گل کر نین سوں رات دن میرے
کہ پانی ہو کے مجھ سارا کلیجہ ہور جگر نکلے

....

سریجن کا ستم کرنا بجا ہے
کرے ہے امتحاں کس میں وفا ہے

جفا ہر بوالہوس کو زہر لگتی
یکا عاشق کے حق میں خوشنما ہے

سمندر آگ میں رہتا ہے شب روز
یہ تمثیلات عاشق پر روا ہے

....

احمد گجراتی کے نام سے کئی اور شعرا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً قائم چاند پوری نے احمد گجراتی کو شاہ ولی اللہ ولی کا ہمعصر بتایا ہے۔ قائم کہتے ہیں کہ ہندی گیت اور دوہے لکھتے تھے اور کبھی کبھی ریختہ میں بھی فکرِ سخن کرتے تھے۔ اس کے بعد اُن کے یہ تین اشعار نقل کیے ہیں:

شب جو تھے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے در تلک گئے

بوجھی تھی کل میاں سے اپس دل کی مَیں خبر
سو آج لا کے سرتی میرے پٹک گئے

احمد بتا مَیں کیا کروں اب راہِ عشق میں
اِک سانجھ پڑ گئی ہے رو جے پاؤں تھک گئے (۴)

....

شاہ ولی اللہ ولی سے مراد اگر ولی دکنی ہیں تو اُن کا سنِ ولادت اور وفات بالترتیب ۱۶۶۷ء اور ۱۷۲۰ء ہے جس کی رُو سے ولی دکنی، احمد گجراتی (۱۵۳۹ء۔ قبل ۱۶۵۶ء) کے ہمعصر نہیں بنتے اور اگر وہ ولی اللہ شمس دکنی (زمانہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) مراد لیتے ہیں تو اُن کا تخلص شمس تھا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ امین قادری (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) بھی احمد گجراتی کے ہمعصر نہیں ہو سکتے۔ شاہ ولی اللہ امین قادری کے بعد کے ولی اللہ نامی شعرا کے احمد گجراتی کے ہمعصر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو پھر یہ شاہ ولی اللہ ولی کون تھے؟

تذکرۂ اولیائے دکن میں شاہ احمد گجراتی کا لقب میرانجی اور طریقۂ شطاریہ کا پیروکار بتایا گیا ہے۔ مزید یہ کہ شاہ صاحب بادشاہ عالمگیر کے زمانے (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) میں تھے اور جب عالمگیر بیجاپور آیا تو آپ سے ابراہیم عادل شاہ کے مقبرے پر ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب کا سنِ وصال ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء درج ہوا ہے جو اُن کے مثنوی یوسف زلیخا کے مؤلف نہ

ہونے اور شیخ احمد شریف گجراتی سے الگ کسی اور شاعر کے وجود کا عندیہ ہے۔

مولانا شیخ احمد گجراتی میاں مخدوم کے نام سے مشہور ایک اور بزرگ بھی تھے جو شیخ برہان بن ابراہیم کے خلف تھے اور شیخ برہان شیخ احمد کھتو کے مرید تھے۔ مولانا کا سن پیدائش ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء اور سن وفات ۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء ہے جو شیخ احمد گجراتی کے زمانے سے کسی طرح لگا نہیں کھاتا۔

اسی طرح سید شہاب الدین شطاری کے فرزند سید احمد گجراتی کہلاتے تھے اور ہادیِ گجرات کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ چونکہ یہ سید تھے اور مثنوی یوسف زلیخا کے مصنف شیخ لہٰذا یہ سید صاحب مثنوی کے خالق نہیں ہو سکتے۔ (نوٹ: لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے شیخ اور سید الگ الگ خاندان اور نسبتیں ہیں اس لیے کوئی شیخ نسب کے لحاظ سے سید نہیں ہو سکتا)

ایک اور دکنی شاعر کا نام یا تخلص بھی احمد تھا جنھوں نے شاہ عنایت کے نور نامے میں اضافہ کر کے اسے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ مزید ایک احمد گجراتی بھی ہیں جنھوں نے مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں مکمل کی مگر ان ہر دو حضرات کا عہد بھی شیخ احمد گجراتی سے بہت بعد کا ہے۔

مثنوی ''بستانِ شہادت'' بھی احمد تخلص کے ایک شاعر کی کاوش ہے جن کا نام سید درویش تھا۔ ایک تو یہ بھی سید تھے اور دوسرے یہ مثنوی یوسف زلیخا کی تصنیف کے بہت عرصہ بعد ضبطِ تحریر میں آئی اس لیے یہ احمد بھی یوسف زلیخا کے شاعر نہیں۔ گویا شیخ احمد شریف گجراتی کے علاوہ جتنے احمد گجراتی نامی شعرأ کا ذکر ادبی یا تاریخی کتابوں میں ملتا ہے وہ شیخ موصوف سے الگ شعرأ ہیں۔

حوالہ جات

(۱) مثنوی ''یوسف زلیخا'' مطبوعہ: حیدرآباد، جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۱۹۔

(۲) مثنوی ''پھول بن'' مطبوعہ: ترقیِ اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۱۸۳۔

(۳) ان کے یہ اشعار میر تقی میر نے ''نکات الشعرأ'' (مطبوعہ: ادارۂ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۹۷) میں لکھے ہیں جن میں سے تین شعر بغیر کسی سیاق و سباق کے قدرت اللہ شوق نے ''طبقات الشعرأ'' (مطبوعہ: مجلسِ ترقیِ ادب لاہور جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۲۳) میں درج کیے ہیں۔

(۴) تذکرہ ''مخزنِ نکات'' از قائم چاندپوری (مطبوعہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۸)

☆☆☆☆☆

تازہ دم شاعر قیوم طاہر کی ایک حیران کُن طویل غزل "خواب وخیال کا میلہ میں"

میرے بہت قریبی دوست، ہم عصر اور اب سینئر شاعر کے درجے پر فائز قیوم طاہر ابتدائے عمر ہی سے شعر میں نئی بات کہنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں حیات و ممات، فنا و بقا، عشق و محبت، ہجر و وصال کی کیفیات اپنے منفرد لہجے میں ڈھل کر ان کے شعر کو زرخیز کرتی جاتی ہیں۔ ہماری 'ہم عصری' اور دوستی کو اب تک کم از کم پانچ عشرے گزر چکے ہیں اور ان کے ارتقائی مراحل میرے دیکھے بھالے ہیں۔

لیکن ابھی حال ہی میں ان کی ایک انتہائی انفرادی انداز کی کتاب "خواب وخاک کا میلہ میں" نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی ردیف میں کوئی سو پچاس نہیں، پورے پانچ سو چودہ اشعار پر مشتمل مسلسل اور طویل تر غزل کہنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ پھر صرف ایک لفظی ردیف "میں" کے ساتھ پانچ سو پندرہ قافیوں (پانچ سو چودہ اشعار میں پانچ سو پندرہ قافیے اس لیے کہ مطلع دو قافیوں پر مشتمل ہوتا ہے) میں نئے مضامین اور موضوعات نکالنا ایک تخلیقی ہنرمندی اور تخیلاتی توفیقات کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

یہ کتاب اسی سال فروری میں زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی جیسے معروف اشاعتی ادارے سے اپنی روایتی آب وتاب اور تزئینِ حسن کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ جس میں جناب یاسر کیانی، خاور اعجاز اور حمید شاہد صاحبان کے دیباچے یا مضامین قیوم طاہر کی تخلیقی ارتقاعی کا اعتراف کر رہے ہیں۔ قیوم طاہر جیسے روایت شکن شاعر نے کتاب میں اپنا پیش لفظ شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان کا ہر شعر ہی ان کا تخلیقی تعارف ہے۔ یہاں ان فاضل نقادانِ فن کی تحاریر سے اقتباس دینے کے بجائے میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ قیوم طاہر کے اشعار پر ہی میرا اظہاریہ محیط رہے۔

نسیم سحر

اس کتاب کی اہمیت محض غزل کی طوالت کے سبب نہیں بل کہ ان موضوعات و مضامین کے سبب ہے جو سات، آٹھ آٹھ لفظوں پر مشتمل ایک محدود 'کینوس' میں رہ کر قیوم طاہر کی تخلیقی زرخیزی کی گرفت میں آئے ہیں۔ ان کا یہی کمال کیا کم ہے کہ صرف ایک لفظ 'مَیں' کی ردیف میں بے شمار انوکھے قافیوں میں نت نئے مضامین کے دفتر کھولتے چلے گئے ہیں اور کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ انھوں نے ان پانچ سو چودہ اشعار میں کوئی قافیہ دہرایا نہیں ہے۔ پہلے ان کے دو 'انتسابی شعر' ملاحظہ ہوں جس میں گویا وہ ایک شعری پیش لفظ میں اپنی تخلیقی شخصیت کا تعارف کرا گئے ہیں:

کل بھی زندہ تھا، آج بھی زندہ مَیں
اپنے ماضی کا سایہ مَیں، فردا مَیں

مَیں اُجلے رنگوں کی خوشبو کا نغمہ
ہجر بسی اِن شاموں کا ہوں گریہ مَیں

....

قیوم طاہر کی اس غزل میں رومانی اور جمالیاتی رنگ بھی ہیں، مگر عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس غزل میں تقدیسی اور عقیدتی رنگ بھی جابجا روشنیاں بکھیر رہے ہیں۔ اس غزل کے اختتام پر یہ حمدیہ اشعار خاص طور پر "انجام بخیر" کی نوید دے رہے ہیں:

ازّل دن سے سب روحوں کا وعدہ تھا
روزِ ابد کا عہد کیا ہوں پورا مَیں

ایک پتہ جو تیری ہے، وہ کافی ہے
سب بھکاتی آوازوں سے بچتا مَیں

سنتا ہے تُو چپ کو، اور آوازوں کو
لگ کر تیرے دروازے سے بیٹھا مَیں

....

قیوم طاہر کی جدتِ بیان بھی کہیں کہیں ایک لفظ چھوڑ کر "ندرتِ بیان" کا اعلان نامہ بن جاتی ہے۔ جیسے کئی اشعار میں اُس نے "میں نے" کے بجائے صرف ردیف "مَیں" پر اکتفا کرتے ہوئے بھی اپنی بات کو مکمل کر دیا ہے:

تیز چلی ہو، اترائی سے کھائی تک
سانس کی راہ ختم سے یونہی پوچھا مَیں

ایسی گھپ میں اک دو لمحے بھڑکا تھا
ایسی گھپ میں، کچھ تو کیا اُجالا مَیں

یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ مٹی تھا
منڈی میں جو بیچا اور خریدا مَیں

....

ان کے ہاں مقامی ثقافت اور خصوصاً پوٹھوہاری رہتل کے عکاس شعر بھی ملتے ہیں، اور شعروں کے متن میں بھی کچھ خالص پوٹھوہاری ثقافت کے الفاظ قابلِ ذکر ہیں:

اتنے موڑ انا کے ہیں، اُکتا جاؤں
بل کھاتا اک پوٹھوہاری رستہ میں

یادیں لڈی ڈال رہی تھیں کمرے میں
خوشیاں دستک دیتی تھیں، پہ تالا میں

اسی طرح کچھ بہت ہی جدید انداز کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نزدیک تو آپہنچا تھا چالوں سے
بچ کی ڈی سے گول نہیں کر پایا میں

سانسوں کے اس میچ میں آخر ہارا ہوں
دنیا کے میدان میں یونہی بھاگا میں

ریشم جیسے حرف الجھتے رہتے ہیں
پتھر فونٹ سے آنسو لکھتا جاتا میں

تھوڑی دیر ٹھہرنا ، پھر چل دینا تم
راہ فنا میں ستانے کو ڈھابا میں

ہر ماڈل کی گاڑی کا شو روم سجا
اپنے جیسا لے آیا تھا ٹھیلا میں

ملک کی ناگفتہ بہ صورتِ حال اور امتِ مسلم کے اہم موضوعات بھی قیوم طاہر نے عمدگی سے برتے ہیں:

شعر رجز کے پڑھ کر میں تو نکلا تھا
اک ٹوٹی تلوار پہ نوحہ کرتا میں

وہ جنگیں بھی ہار آیا ہوں جو لڑی نہیں
گرد پڑی تھی چہرے پر جب لوٹا میں

میں نے اپنا پرچم دھجی میں بدلا
اپنے حق کی جنگ نہ کی اور ہارا میں

درج بالا موضوعات کے علاوہ بھی اس مسلسل غزل میں قیوم طاہر کی رومانوی عمر کے عکاس بہت سے اشعار میں لمسیات کی بھی جھلک ملتی ہے اور محبت کی ہار جیت کی کیفیات بھی۔ اس مضمون میں مزید گنجائش ہوتی تو قیوم طاہر کے اس خواب و خیال کے میلے سے کئی منظر نامے پیش کیے جا سکتے تھے مگر کہیں تو ہے قصہ تمام بھی کرنا!

اس اظہاریے کو میں اپنے ہم عصر سینئر شاعر خاور اعجاز کے دیباچے کی دو سطروں پر تمام کرنا چاہوں گا کہ اس سے بہتر تعارف کسی اور کے دیباچے میں نظر سے نہیں گزرا، سچ تو یہ ہے کہ خاور اعجاز نے ان دو سطروں میں قیوم طاہر کی شاعری کا نچوڑ پیش کر دیا ہے:

”قیوم طاہر نے متعدد اصناف سخن کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے، لیکن اُس نے یہ طویل مسلسل غزل کہہ کر جس طرح اس نیم وحشی صنفِ سخن کو آمادۂ تہذیب کر رکھا ہے، وہ اسی کا حصہ ہے“۔

☆☆☆☆☆

اُجالے اپنی یادوں کے

"اجالے اپنی یادوں کے" پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری کی یادداشتوں پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ کتاب آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ پروفیسر اظہار بخاری نہ صرف معروف ماہر تعلیم بل کہ ایک اعلیٰ پائے کے منتظم ادارہ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی چھتیس برس وفاقی تعلیمی اداروں میں بحیثیت معلم اور منتظم فرائضِ منصبی سرانجام دیے۔ آپ کا حلقۂ احباب نہایت وسیع ہے۔ کیوں کہ آپ نے وفاقی دارالحکومت کے چار کالجوں میں پرنسپل کی حیثیت سے اور ایک پوسٹ گریجویٹ کالج میں بطور وائس پرنسپل فرائض سرانجام دیے۔ آپ نے نہایت متحرک زندگی گزاری۔ دورانِ ملازمت بھی تصنیف و تالیف سے بھی آپ کا تعلق قائم رہا۔ اور مدت ملازمت سے سبک دوشی کے بعد آپ کی تحریر کردہ یادداشتوں پر مشتمل کتاب "اجالے اپنی یادوں کے" اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے یہ کتاب صاحب تصنیف کے دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ذاتی حالات وواقعات، مشاہدات وتجربات اور مرقع نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نہایت سچائی اور دیانت داری سے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو نہایت خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے اور کہیں بھی تصنع سے کام نہیں لیا۔ آپ کی ذات کے بنیادی عناصر میں عجز و انکساری محبت و مروت اور فقر و درویشی شامل ہے۔ جس کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ یادداشتوں پر مشتمل اس کتاب میں انھوں نے اپنے اُن رفقائے کار کو فراموش نہیں کیا جن کے ساتھ انھوں نے رفاقت

نثار ترابی

کے طویل لمحات گزارے۔ اور ان کی خوبیوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ان رفقائے کار اور عزیز دوستوں پر جو شخصی خاکے اور مضامین تحریر کیے وہ اس کتاب کی زینت ہیں۔ آپ نے اپنے ان احباب کا بھی ذکر کمال خوبی سے کیا ہے جو بقیدِ حیات ہیں۔ ان مضامین اور شخصی خاکوں میں مرقع نگاری کے عمدہ نمونے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے قومی افق پر پیش آنے والے حادثات اور قدرتی آفات سے متعلق اپنی یادداشتوں کو بھی نمایاں جگہ دی ہے۔ آپ نیارضِ مقدس اور زیارتِ حرمین شریفین کا ذکر جس عقیدت اور محبت سے کیا ہے وہ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے۔ اڈیالہ جیل کے دورے کے دوران آپ نے انسانی تذلیل کے جو مناظر دیکھے وہ ہر حساس شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یاد نگاری کے لیے اچھی یادداشت کا ہونا ضروری ہے ۔ اسی طرح آپ بیتی میں صاحبِ تصنیف اپنی زندگی کے کئی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے بے حجاب کر دیتا ہے۔

بقول جان ڈینٹن:

"My soul may naked
here be seen,
Both what I should
have been,
Dissected thus I stand
a living mistery grown,
Come read my errors
and reform your own."
(John Dunton)

ترجمہ:

"میں نے اپنی روح کو کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ممکن ہے میں اس میں آپ کو بے حجاب نظر آؤں اور اس بے حجابی میں زندہ شہادت ہے۔ آؤ میری غلطیوں کو پڑھو اور اپنی اصلاح کرو۔"

گویا آپ بیتی میں صاحبِ تصنیف کی زندگی کی جامع تصویر نظر آتی ہے۔ یہ نا صرف قارئین کو پڑھنے پر راغب کرتی ہے بل کہ اس سے اثر پذیری کے ساتھ ساتھ مشاہدات و تجربات سے سیکھنے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ آئیے اب زیرِ نظر تصنیف میں مختلف واقعات، مشاہدات اور خاکہ نگاری کی چند تصویریں ملاحظہ کریں۔

"۱۰ اپریل ۱۹۲۸۸ء کا دن راولپنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہروں پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ ہر طرف ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ فضا میں اڑتے میزائل جگہ جگہ گر کر عجیب خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رہے تھے۔ ان جڑواں شہروں کے لوگ عالمِ بے سروسامانی میں انجانی منزل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کچھ محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اچانک کیا ہو رہا ہے؟"

("اجالے اپنی یادوں کے" ص نمبر ۳۹)

"کالج کے احاطے سے 55 میزائل اکٹھے کر کے پاکستان آرمی کے حوالے کئے گئے۔ اس خوفناک واقعے کے دوران راولپنڈی اسلام آباد میں میں ۹۳ اموات ہوئیں اور ۱۱۰۰ افراد شدید زخمی ہوئے۔ سینکڑوں مکانات کو بھی نقصان پہنچا۔ اس واقعے کے دوران اُن دنوں وزیراعظم پاکستان محمد خان جونیجو کی کابینہ کے وفاقی وزیر صنعت و پیداوار خاقان عباسی (سابق وزیراعظم پاکستان شاہد خاقان عباسی کے والد) کی گاڑی پر بلیو ایریا میں ایک میزائل آ کر لگا جس سے وہ موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ جبکہ اُن کے ہمراہ گاڑی میں سوار بیٹے زاہد عباسی شدید زخمی ہو گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ زاہد عباسی ۱۷ سال تک زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد سال ۲۰۰۵ء میں فوت ہوئے۔"

("اجالے اپنی یادوں کے" ص نمبر ۱۵)

ایک اور واقعے کی تصویر کشی ملاحظہ فرمائیں:

"ابھی اوجڑی کیمپ کے سانحے کا اثرات کم نہیں ہوئے تھے کہ اگلے سال موسم گرما کی تعطیلات کے خاتمے پر ایک دلخراش واقعہ پیش آیا۔ ہاسٹل میں مقیم طلباء تعطیلات میں گھروں کو لوٹ جاتے تھے اور تعطیلات کے اختتام پر واپس آتے تھے۔ ہاسٹل میں گلگت بلتستان کے کافی بچے مقیم تھے۔ موسمِ گرما کی تعطیلات کے اختتام پر ۲۵ اگست ۱۹۸۹ کو گلگت سے ایچ نائن کالج کے چند طلباء پی آئی اے کی پرواز PK-404 کے ذریعے فوکر F-24 طیارے پر اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس پرواز میں عملے کے پانچ ارکان کے علاوہ ۴۹ مسافر سوار تھے۔ اڑان بھرنے کے صرف ۹ منٹ کے بعد جہاز کا کنٹرول روم سے رابطہ منقطع ہو گیا اور جہاز لاپتہ ہو گیا۔ آج اس واقعے کو ۳۵ برس گزر چکے ہیں لیکن تاحال اس جہاز کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس جہاز میں سوار مسافروں اور عملے کے افراد کے اہل وعیال آج بھی غمزدہ ہیں۔ ایچ نائن کالج کے طلباء اور اساتذہ اس سانحے پر آج بھی دل گرفتہ ہیں۔ ایک مدت تک کالج اور ہاسٹل کی فضا سوگوار رہی۔ وہ کالج کے در و دیوار اور ہاسٹل (جہاں ان بچوں کے قہقہے گونجتے تھے) ویرانی کا منظر پیش کرنے لگے۔"

("اجالے اپنی یادوں کے" ص نمبر ۴۱)

صاحبِ کتاب کو دورانِ ملازمت مختلف تربیتی پروگراموں میں شرکت کے مواقع میسر آئے۔ ایک بار سیکریٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد میں "بنیادی انسانی حقوق" کے موضوع پر ایک تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں وفاقی وزارتوں اور محکموں کے افسران شریک ہوئے۔ تربیتی پروگرام کے اختتام پر شرکاء کو اڈیالہ جیل کا دورہ کرایا گیا۔ اس دورے کی تفصیلات بھی یادداشتوں کا حصہ ہیں۔ ذرا جیل میں

انسانی تذلیل اور کرب کی تصویر دیکھیے۔

''اس کے بعد خطرناک قیدیوں کے سیل دکھائے گئے جو تقریباً 4x4 کے ہوں گے جہاں ایک شخص کے لیے کھڑا ہونا بھی مشکل کام تھا۔ پھانسی کی سزا پانے والے مجرمان کو چھوٹی چھوٹی کال کوٹھڑیوں میں رکھا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان خطرناک مجرموں کے سیل روزانہ تبدیل کر دیے جاتے ہیں اور انھیں دوسرے قیدیوں سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ بعدازاں وفد کو پھانسی گھاٹ بھی دکھائے گئے۔ میں اس کا تصور کر کے بھی کانپ اٹھا کہ یہاں تو موت بھی بتا کر آتی ہے، اچانک نہیں آتی۔ جلادوں کی بے دردی اور تختۂ دار پر لٹک جانے والوں کی بے کسی کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔''

(''اجالے اپنی یادوں کے''،ص نمبر ۸۰)

اسی دورے کے دوران انسانی تذلیل کے جو ہولناک واقعات صاحبِ تصنیف کے مشاہدے میں آئے، ان کی وجہ سے نہ صرف وہ ایک مدت تک بے چین رہے بلکہ ایسے واقعات کی وجہ سے ہمارے نظامِ انصاف پر بھی کئی سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنی قریبی دوستوں اور رفقائے کار کے شخصی خاکے بھی تحریر کیے ہیں جن کا ادبی حسن نہایت دلکش ہے۔ ان شخصی خاکوں میں سے چار احباب کی تصویری جھلک ملاحظہ فرمائیں:

''۱۹۷۸ میں میری پہلی ملاقات ایک خوش وضع نوجوان سے ہوئی۔ یہ نوجوان پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ گورا رنگ، ہلکی ہلکی مونچھیں، دھان پان جسم، خوبصورت آنکھیں، چہرے پر شرافت اور متانت کی جھلک، پُر تاثیر اندازِ گفتگو غرض اس دل موہ لینے والے نوجوان سے تعارف ہوا۔ یہ نوجوان محمد جہانگیر میر تھے جن سے پہلی ہی ملاقات نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔''

(مراہم نشیں، مراہم سفر، ص نمبر ۱۱۰)

''7 اکتوبر 1984ء کی صبح ایچ-نائن کالج میں ایک دھان پان سی شخصیت سے آمنا سامنا ہوا۔ دراز قد، ستواں ناک، تیکھے نقش، شلوار قمیض اور ویسٹ کوٹ میں ملبوس، چہرے پر بشاشت اور لہجے میں خود اعتمادی، سراپا عجز و انکسار، اندازِ تخاطب میں گلیات کے لہجے کی جھلک، سر پر بسکٹی رنگ کی گلگتی ٹوپی پہنے اُس نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اُس کا نام ریاست علی عباسی ہے۔''

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا ہے

(ص نمبر ۱۴۱)

''اگلی صبح ہم نے ایک نووارد کو برآمدے میں چکر لگاتے دیکھا۔ بھاری بھرکم جسم، گورا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں (تپلی عینک ناک کے نیچے تک)، گھنی سیاہ بھنویں، لمبے لمبے بال (ہمیر جیل لگے) ایک خاص انداز سے

اُوپر کی جانب کنگھی سے بٹھائے ہوئے، بسکٹی رنگ کا خوبصورت قیمتی سوٹ، سفید قمیض، سرخ ٹکٹائی، سوٹ کے کالر میں پھول اٹکایا ہوا، پاؤں میں انگریزی جوتا اور تیز خوشبو (جس کی مہک پورے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی)، اس نو وارد کو دیکھنے کے لئے طلباء کثیر تعداد میں جمع ہوگئے۔''
(بدلا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے، ص نمبر ۱۵۴)

''غالباً سال ۲۰۰۰ کا ذکر ہے میں نے اپنی پہلی کلاس سے فارغ ہوکر شعبۂ اُردو میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک نوجوان نے کرسی سے اٹھتے ہوئے نہایت خلوص سے سلام کیا۔ میں نے اُس کے سراپا پر نظر ڈالی تو ایک پُرکشش شخصیت دکھائی دی۔ درمیانہ قد، سانولی رنگت، بادامی آنکھیں، ستواں ناک، چہرے پر متانت، عمدہ ہیئر اسٹائل، نہایت عمدہ براؤن سوٹ، سرخ ٹکٹائی (جس کی ناٹ نہایت خوب صورتی سے بنائی گئی تھی) جو ہلکے گلابی رنگ کی قمیض پر نہایت نفیس لگ رہی تھی اور پاؤں میں انگریزی بوٹ۔''
لوگ رخصت ہوئے اور لوگ بھی کیسے کیسے
(ص نمبر ۱۶۴)

ان تصویری خاکوں کے ساتھ ساتھ مصنف نے اپنے حج و عمرے اور زیارت حرمین شریفین کے اسفار کو بھی زیب قرطاس کیا ہے۔ یہاں قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی مصنف کا ہم سفر ہو۔ علاوہ ازیں یہ سفری مشاہدات و تجربات زائرین کے لیے رہنمائی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ان مقامات مقدسہ کے سفر میں جگہ جگہ عمدہ منظر کشی اور محاکات (امیجری) دکھائی دیتی ہے۔ اپنے ایک سفر کے حوالے سے آپ تحریر کرتے ہیں:

''بنی سعد طائف سے بھی آگے ۷۰-۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ خیر دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد پہاڑوں کے درمیان واقع ایک جگہ پر پہنچے جہاں حضرت بی بی حلیمہ سعدیہ کا گھر تھا۔ یہاں ایک کمرے میں (جس کے اب صرف آثار ہیں) جائے نماز بچھے ہوئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں دو کمرے تھے۔ ایک میں حضرت بی بی حلیمہ رہتی تھیں اور دوسرے میں بچے۔ آپ رضاعت کے لئے یہیں آنحضورؐ کو لے کر تشریف لائی تھیں۔ ارد گرد کوئی آبادی نہ تھی۔ بالکل ویران علاقہ۔ یہاں نوافل ادا کیے۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ آنحضورؐ یہاں اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکریاں چراتے تھے۔ سامنے والا پہاڑ دکھایا گیا جہاں شق القلب کا واقعہ ہوا تھا۔ ہمیں اپنی قسمت پر ناز تھا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ جگہ دکھائی جہاں ہمارے پیارے نبیؐ، سرور کائنات، آقائے دو جہاں، خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی پرورش ہوئی تھی۔ (بنی سعد کا اصل قصبہ تقریباً آٹھ کلو میٹر دور واقع ہے جہاں بنیادی شہری سہولیات میسر ہیں۔) لیکن یہاں تو کچھ بھی

نہیں تھا۔ اللہ کی قدرت کہ اُس نے اپنے محبوب کی پرورش کس سخت پہاڑی مقام پر کی جہاں چودہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کا باوجود آج بھی کوئی کھانے پینے کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔''

(''اجالے اپنی یادوں کے'' ص نمبر ۷)

آپ نے جدید اسلوب کی چاہت میں کسی غیر ضروری لفاظی یا گنجلک ترکیب سازی کے زور پر کسی دوراز کار مضمون تک معنوی رسائی کو آواز دینے کی سعی نہیں کی۔ بل کہ اس کتاب میں ایک راست باز، صداقت پسند انسان کے انسانی اظہار کے فطری اور بے ساختہ قلبی اضطراب، فطری بے ساختہ واردات قلب ونظر کی داستانِ علم وجستجو واضح دکھائی دیتی ہے۔ اپنی یادداشتوں کے تعلق کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک سچے محبِ وطن ایک لائق تکریم معلم، ایک دردمند حلیم الطبع انسان اور شائستہ خو

ادیب نے ہمیں اپنی یادوں کے ان اجالوں میں ایک ایسے باغ کی سیر کرائی جس میں اس کے اپنے من موہنے جھیلے رسیلے جیون کا اضطراب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ایک ایسا اضطراب جس میں جذباتی وابستگی، روحانی سرشاری اور پیشہ ورانہ اخلاص کی خوشبو رچی بسی ملتی ہے۔ اس کا سادہ پیرایۂ فکر یہ پیغام دیتا ہے کہ سچائی کو اپنا آپ منوانے کے لیے کسی ظاہر نقش ونگار کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ اور یہ کہ انسانی زندگی میں خیرو فلاح، دردو سخاوت، ایثار و پیار، علم وادب سے سچی وابستگی اور صراط مستقیم پر چلنے کی خوبی ہمیں با کردار بنا سکتی ہے۔ مشاہدات و تجربات پر مبنی ذاتی احوال اور پیشہ ورانہ وابستگی سے سجی ان کی داستانِ حیات کے ہر ہر باب میں تک وتاز جاودانہ کے سیکڑوں مناظر جگمگا رہے ہیں مگر کہیں کسی مقام پر بھی قاری کو یہ گمان نہیں گزرتا جو ہمیں منیر نیازی کے اس معروف شعر کی یاد دلاتا ہو۔

آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

....

بل کہ اس کے برعکس یہ احساس دلوں میں جگہ بناتا ہے کہ جو یادوں کے ان اجالوں میں دور دور تک دلچسپی، توجہ اور لطف کی چاندنی تو بکھرتی دکھائی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس سوانح حیات پر بغور نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اظہار بخاری صاحب کی زندگی جتنی بھی گزری ایثار و پیار اور انکسار میں گزری۔ انسانی دردمندی کے بھی اوصاف ان کے ہر دل عزیز اور بھولی بھالی شخصیت کے عکاس بھی ہیں اور ترجمان بھی۔ دعا ہے کہ مولائے کائنات حسن وعمل کے یہ سرمدی چراغ ان کی فکری زندگی کا یوں ہی امتیاز بنائے رکھے۔ یہ اظہار کی روشنی اسی طرح لٹاتے رہیں، جگمگاتے رہیں اور مسکراتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

14 اگست 1926 سے 14 اگست 2026

(صد سالہ جشن پیدائش)

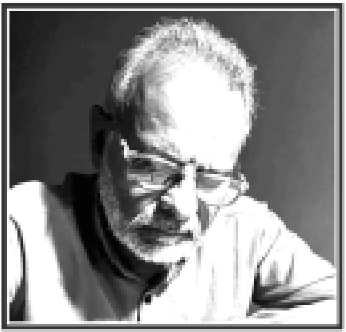

محمد طفیل نقوش ایک ایسی عظیم الشان عہد ساز ادبی شخصیت جس کے بارے میں لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔

محمد طفیل صاحب آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے 14 اگست، 1926 کو لاہور، برطانوی صوبہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔

انھوں نے نامور خطاط تاج الدین زریں رقم سے خوشنویسی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے 1944 میں ادارہ فروغ اردو کے نام سے ایک طباعتی ادارہ قائم کیا۔

طفیل نقوش کی پاکستان رائٹرز گلڈ کے لیے خدمات: پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام 29 جنوری 1959 مولوی عبدالحق کی سربراہی میں عمل میں آیا، جس میں محمد طفیل سمیت دیگر نامور اہل قلم نے بھرپور حصہ لیا، محمد طفیل نے طویل عرصے تک رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے اور ادیبوں کے حقوق وفلاح کے لیے بہت کام کیا، رائٹرز گلڈ کی زمینیں جو آفس اور ادبا کے لیے گورنمنٹ نے الاٹ کی تھیں جو قبضے میں چلی گئی تھیں ان کو قبضہ مافیا سے واگزار کرانے میں طفیل نقوش صاحب کا اہم کردار ہے۔

محمد طفیل کے بعد ان کے صاحبزادے جاوید طفیل نے ادارہ نقوش اور رائٹرز گلڈ کے بعض انتظامی امور کو سنبھالا اور اس ادبی ورثے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

نقوش کے چند اہم اور مشہور خصوصی شمارے جو شخصیات نمبر: نامور شعرا اور شخصیت اور فن

اظہر رضوی

کے لیے مخصوص ادبا کے احوال پر مشتمل ہیں جو برصغیر پاک و ہند میں بہت مقبول ہوئے جن کی نظیر نہیں ملتی

- جشن آزادی نمبر
- رسول نمبر
- عصری ادب نمبر
- لاہور نمبر
- منٹو نمبر: سعادت حسن منٹو کی
- غالب نمبر: مرزا غالب کے خطوط، کلام اور نادر مسودات کا احاطہ کیے ہوئے۔
- میر نمبر: میر تقی میر کی شاعری اور احوال پر مبنی۔
- طنز و مزاح نمبر: اردو کے بہترین طنز و مزاح پر مبنی طویل شمارہ۔
- خطوط نمبر: اردو مکتوب نگاری کا قیمتی سرمایہ۔
- آپ بیتی نمبر: مختلف نامور شخصیات کی خودنوشتوں کا مجموعہ۔
- افسانہ و غزل نمبر: بہترین اردو کہانیوں اور غزلوں کے انتخابی حصے
- ان کی خودنوشت بعد از مرگ ناچیز کے عنوان سے شائع ہوئی اور رسالہ نقوش نے محمد طفیل نمبر جاری کیا۔

دیگر ادبی خدمات

آپ نے 1944 میں ادارہ فروغ اُردو کے نام سے ایک طباعتی ادارہ قائم کیا۔ 1948 میں لاہور سے مشہور ادبی جریدہ ،،نقوش،، کا اجراء کیا۔ یہ جریدہ لاہور سے شائع ہوتا تھا جس کے اوّلین مدیر احمد ندیم قاسمی تھے جب کہ بعد میں یہ ذمہ داری خود محمد طفیل نے سنبھال لی۔ اور خود ان کی پہچان بن گیا۔ نقوش اپنے وقت کا ایک معروف ادبی جریدہ تھا، جس نے مختلف شخصیات اور مواقع پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ نقوش کے پہلے شمارے میں جن ادیبوں کی تخلیقات شامل تھیں ان میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، عزیز احمد، حفیظ جالندھری، سیماب اکبر آبادی، یوسف ظفر، قیوم نظر، قتیل شفائی، اثر لکھنوی، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، حفیظ ہوشیار پوری، علی سردار جعفری، عبد الحمید عدم، خالد حسن قادری، مختار صدیقی، سیف الدین سیف اور عبدالعزیز فلک پیا کے نام شامل تھے۔

انھوں نے علامہ محمد اقبال کے صد سالہ جشن پیدائش پر نقوش کے تین خصوصی اقبال نمبر شائع کیے۔ یہ تینوں خصوصی جریدے ستمبر 1977 نومبر 1977 اور دسمبر 1977 میں شائع ہوئے۔ نومبر 1977 میں شائع ہونے والا اقبال نمبر اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اس میں وہ تمام مضامین شامل تھے جو 1932 میں علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہونے والے پہلے اقبال نمبر نیرنگ خیال میں شامل تھے۔

نقوش کے تحت غزل وافسانہ پر خصوصی شماروں

کے علاوہ شخصیات نمبر، خطوط نمبر، آپ بیتی، طنز و مزاح نمبر شائع ہوئے جب کہ منٹو، میر، غالب، اقبال، انیس جیسے نابغہ روزگار شخصیات کی تخلیقات اور تذکروں پر مبنی شمارے اور مختلف ادبی موضوعات پر خصوصی اجرا شامل ہیں۔ یہ سلسلہ پاک و ہند میں پسند کیا گیا اور اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ محمد طفیل نے جب غالب نمبر کے لیے مرزا غالب ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ اپنے جریدے نقوش کی زینت بنایا تو اردو دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور بھارت میں بھی یہ کہا گیا کہ اگر یہ مسودہ بھارت میں دریافت ہوا ہے تو پاکستان کیسے پہنچا اور کیسے پاکستان کے ایک مدیر نے اسے شائع بھی کر دیا۔ محمد طفیل نے متعدد سالنامے اور افسانہ نمبر چھاپنے کے بعد نومبر 1957 میں دو جلدوں میں مکاتیب نمبر شائع کیا۔ اس نمبر میں 155 شخصیات کے 1552 مکاتیب شائع ہوئے۔ اس سے پہلے کسی نے اتنی بڑی تعداد میں خطوط شائع نہیں کیے تھے۔

دیگر تصانیف

- صاحب (1955)
- جناب (1961)
- آپ (1967)
- محترم (1968)
- مکرم (1970)
- معظم (1974)
- مجی (1981)
- مخدومی (1983)

اعزازات

حکومتِ پاکستان نے آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے آپ کو (محمد نقوش) کا خطاب دیا تھا۔

وفات

محمد طفیل 5 جولائی 1986 کو اسلام آباد میں وفات پاگئے تھے۔ آپ کی تدفین لاہور میانی صاحب قبرستان میں ہوئی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

،،علامہ اقبال،،

،،آخر میں خصوصی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جناب ظفر معین بلے صاحب فرزند جناب سید فخرالدین بلے صاحب کا جن کے تعلقات طفیل نقوش صاحب کی فیملی کے ساتھ دیرینہ مراسم ہیں جس کی وجہ سے بہت ساری معلومات مجھے فراہم کرتے رہے ان کی معاونت و سرپرستی کے بغیر شاید اتنی تفصیل سے نہیں لکھ سکتا تھا اللہ تعالیٰ ظفر معین بلے صاحب کو صحت و تندرستی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے اور خانوادہ کا یہ ستارہ جگمگاتا رہے۔

☆☆☆☆☆

گیان کو نوری شجر کہیے

نوید شہزاد نے تحقیق و تنقید ایسے ثقہ علوم کی سرمدی سنگت کو جملہ مقتضیات سمیت قبولتے ہوئے اپنی ذات میں مقیم 'شاعر' کی صیانت کو کیسے یقینی بنایا؟ یہ ایک بھید ہے! تحقیق کی رگوں میں ناپ تول کا اعشاری نظام مؤثر رہتا ہے کہ یہ اس کا لازمی اقتضا جو ہوا۔ البتہ یہ جادو Mirror Neurons کے ذریعے اکثر اپنا کام یوں دکھا جاتا ہے کہ شبدوں کی خلقی کشادگی ہندسوں کا چست لباس پہننا سیکھ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ لفظ سمٹ کر یا Concise ہو کر عدد کے مماثل ہو جاتا ہے، قطعیت زدہ ہونے پر فاخر۔ جی ہاں! تربیت یافتہ محقق اور نقاد اپنی تخلیقات میں بھی اس قدر حسابی (Calculative) دکھائی دینے لگتا ہے کہ گویا ہر اکھر کی جیومیٹری متعین بل کہ مطلق ہے۔ واضح رہے زندہ لفظ محض حروف کی تعداد کا احترام کرتا ہے، کبھی اپنے معانی کے امکانات پر سمجھوتا نہیں کرتا۔

مسلم علمیات کی پیہم صحبت کے باوصف ہمارا یہ سخن ور نوید شہزاد رہ و رسم شاعری سے قطعاً بیگانہ نہیں ہوا۔ چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن کو بھی جاری رکھا۔ زیرِ نظر مجموعے: ''گیان والا سٹ سیشن'' کی ہر نظم ہی نہیں ہر سطر اس آزاد فکری فضا کا صلہ و ثمر قرار پائے گی جسے اپنی دوشیزگی پر نازاں ہونے کا اصولی حق حاصل ہے۔ یوں مذکورہ نظمیہ متون مستعار عقائد و نظریات کی منظوم ترجمانی سے منزہ ہیں۔

نوید شہزاد نے اپنی محبوب زبان 'پنجابی' کا چناؤ کر کے بلاشبہ ثقافت کی اسارت کو بنیادی درجے میں تسلیم کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی نظمیں روایت سے پیوست عمومی تقلیدی میلان کو ظاہر نہیں کرتیں۔ خاکسار کا یہ مفروضہ بھی غالباً درست ہونے

جمیل احمد عدیل

کا امکان رکھتا ہے کہ یہی نظمیں کسی دوسرے لسانی پیکر میں منقلب ہو کر اپنے نزول تاثر کے طلسم کی پاسبانی نہیں کر سکیں گی ــــ لیکن یہ مسئلہ تو ہر متن کے نقش اول سے وابستہ رہا ــــ کہنا یہ ہے کہ شعر و ادب کے لیے کسی خاص زبان کا انتخاب ہی کافی دلیل ہے کہ اس کی جڑیں مٹی میں اتری ہوئی ہیں۔ وہ ہوا میں معلق نہیں۔ نوید شہزاد نے بھی اپنی طبعی تخلیقی من مرضی کے علی الرغم ان نظموں کو گرد و پیش سے منقطع نہیں کیا۔ تاہم انسلاک و انفکاک سے بندھی ہوئی اصل نوعیت کی جانب آگے چل کر کچھ اشارے رقم ہوں گے۔

اس ضمن میں لطیف تر رمز کو نشان زد کرنے کے لیے یہ استفسار ابھارنا پڑے گا کہ نوید شہزاد نے انفراد کے اہتمام کی خاطر کیا تکنیکی / فنی قرینوں کی شعبدہ بازی سے مستفید ہونا چاہا ہے یا ندرت کا انکھوا اس مرکزے سے پھوٹا ہے جس سے جڑ کر متذکرہ نظم نے اپنی شاخیں نکالی ہیں یعنی کیا وہ اپنے اساسی خیال کی پیشکار ہے یا نہیں؟ تو ایک عام خوانندہ کی حیثیت سے اس عاجز کی یہ سوچی ہوئی رائے ہے کہ نوید کی ایک نظم بھی صناعی کی مظہر نہیں۔ چونکا دینے والے امیجز، خیرہ کر دینے والی بندشیں، متحیر کر دینے والی تشبیہیں، گنگ کر دینے والے استعارے، دلکش تلمیحیں، تلازمہ کاری کے کرشمے، اعجوبہء روزگار علامتیں، پراسرار اساطیر۔ غرض صنائع بدائع و دیگر کی چکا چوندھ اور محاسن شعری کے فسوں بے شک قاری کو مسحور کرتے آئے ہیں۔ یہاں آرٹ اور کرافٹ کی بے نقص پیوندکاری بھی حرف تحسین اپنے نام کرتی آئی ہے۔ اس کے باوجود ایک سچ کا عنوان وجدان بھی ہے۔ اس مصدر کے روبرو والہانہ خود سپردگی بھی فیضان کا ایک سرچشمہ ہے۔ یہیں کہیں کسی 'خودکار نظام' کے تحت مصرعوں کی تراش نظمیہ اکائی میں ڈھلتی ہوئی شاعر کے حوالے ہوتی ہے۔ وہب و کسب کا میکانکی اور صریح ہونا بھی تو کسی سرفراز تصور کی تائید نہیں کرتا۔ طرفین کا تخلیقی اتصال 'انحراف' نہیں، نئے رخ کا تعارف ہے۔ باقی مصنوعی ذہانت کو حبالہء عقد میں لے کر ہر طرح سے مزین شاعری کی ملکہ کا تخت طرفۃ العین میں حاضر کر لینا کوئی انہونی تو رہی نہیں۔ یہ الگ بات کہ خود سلطنت سخن کی ملکہ سبا فریب نظر (Optical Illusion) کا شکار ہو کر شیشے کے فرش کو پانی سمجھ کے اپنی فہم کی پنڈلیاں برہنہ کر بیٹھتی ہے۔ نقل کی یہ پرانی نشانی کہ وہ اصل سے بڑھ کر اصل دکھائی

دیتی ہے۔ آج بھی اس کسوٹی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

اس تناظر میں نوید شہزاد کی نظمیں چاہے وحدت کے محدب عدسے تلے رکھ کر دیکھی جائیں؛ چاہے شوقِ تجزیہ کی تسکین کے لیے اجزا میں بانٹ کر ان کا جائزہ لیا جائے؛ اور تخلیقیت کا اختصاص ہر زاویے سے لپٹا ہوا ملے گا۔ رہا قصہ عصر، سماج، تمدن، زندگی کے قضیوں، قاضیوں کی بے عدالتیوں، جبر کے شکنجوں، حاکموں کی عیاریوں، معاشرتی تشتت وانتشار اور فرد کے باطن میں حشر بپا کرب کے شاخسانوں کا تو واقعیت پر مبنی ان عناصر کو منہا کر کے کسی تخیل کی واردات یا Scheming کو ترتیب دینا ہمارے اس شاعر کو شانِ تخلیق کے منافی لگا۔ اس نے جیتے جاگتے مسائل کو پوئٹک کونٹینٹ ضرور بنایا مگر مجال ہے کہیں کلیشے کی شمولیت کے لیے اس نے سہولت کار کا کردار ادا کیا ہو۔

اس باب میں بامراد رہنے کی اساسی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نوید شہزاد کی تخلیقیت میں توانائی مدھم نہیں پڑی بلکہ وہ فزوں تر محسوس ہوتی ہے۔ اس نے شاعری میں جینا سیکھا ہے، سیکھ کر شاعری نہیں کی۔ اسی لیے پہلے بھی وہ عروض واوزان کی حدود وثغور کو صرف ایک طے شدہ پیراڈائم کے طور پر قبول کرتا رہا ہے لیکن اپنے اندازِ نظر کی یکتائی پر وہ بہر حیثیت مصر رہا۔ ظاہر ہے اس راستے پر چلتے ہوئے ناکامی اس کے حصے میں نہیں آئی۔

یہاں یہ عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہوگا کہ صرف نفی وتردید کا دانہ چگنے سے انوکھا پن نصیب نہیں بنتا بل کہ متعارض حقیقتوں کے شعور سے ذہنی افق توسیع آشنا ہوا کرتا ہے۔ پیراڈوکس کی آگہی کا کشٹ کاٹنے سے کائنات کے مختلف گوشے آشکار ہوتے ہیں۔ واقعاتی نگاہ کی ثروت جدل کی مرہون منت رہی۔ یوں خواندگی، مطالعہ، قراءت کے پہلو بہ پہلو جرات سے مشروط تدبر کی صفت سے متصف ہونے کی ناگزیریت بالکل سامنے کی بات بھی نہیں۔ نوید شہزاد نے خود کو پڑھت کے مکتب میں محفوظ کرنے کی راہ نہیں اپنائی بل کہ تفحص کے اوکھے جادے پر گامزن رہنے کو رفتہ رفتہ ترجیح بنا لیا ہے۔ اپنی حالیہ مختصر نثری تحریروں کی طرح ان نظموں میں بھی وہ مسلمات اور مقبول بیانیوں کو معرضِ سوال میں لانے کی روش اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسے Heterodoxy کا ثمر کہیے۔ ایک عافیت پسند، صلح جو اور آشتی کا پجاری لیکن اس جھنجھٹ سے اس لیے گریزاں رہتا ہے کہ اپنے وجود کو تصادم اور آویزش کا کارزار بنانا ایسا سہل نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں

عقیدہ بے حد معاون ثابت ہوتا ہے کہ سوچ کی الجھن سے نجات دلانا اس کا خاص ارمغان ٹھیرا۔ جنھیں ذہانت کی چبھن بے چین کرتی ہے انھیں اعتقاد کے حظیرے سے فاصلہ نہیں اپنانا چاہیے۔ نوید شہزاد ایک ذہین شخص ہے یوں سکون کی بربادی پر پریشانی اس کا مسئلہ نہیں۔ وہ تو ایسا مرتاض ہے کہ بے تابی کو اجر سمجھتا ہے۔ راقم کو ان نظموں میں شاعر Rarefactionn کی حفاظت پر مامور نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے یہ خیال معروضی معیار پر صحیح ثابت نہ ہو لیکن ذاتی طور پر مجھے یہاں موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر ایک ناملائم سا معاملہ اپنا اثر قائم کرتا ہوا ملا۔ امر واقع یہی لگا کہ ان نظموں کی ترشی ہی ان کا اصل فلیور ہے اور یہی ان کا امتیاز۔

ڈاکٹر نوید شہزاد نے اس ادراک کے ساتھ جدید رجحان کی نظم کو مضبوط وسیلۂ اظہار مانا ہے کہ دیگر مروج شعری اصناف بعض نزاکتوں کی مناسبت سے کافی حساس ہیں۔ خاص طور پر غزل اپنی تقدیس و تحریم کی نگہبانی کو اس قدر اولیت دیتی ہے کہ زندگی اور لفظیات کے معتدبہ حصوں سے دستکش ہو جانا اسے خسارے کا سودا نہیں لگتا۔ بہت سارے کھردرے قضیے چونکہ جمالیاتی معیارات کو زک پہنچا سکتے ہیں، سو سدا زمل رہنے کی تمنا اس کی فخریہ ترجیح رہی۔ ایسے میں نوید شہزاد نے یہ نظمیں لکھ کر بخوشی اس خارزار سے کانٹے چن لیے کہ اسے ان میں پوروں کو فگار کرنے کا فراواں سامان ملا۔ اذیت کی کشش سے انکار بھی آسان نہیں، مگر یہ رخ عوامی ہے نہ مرغوب! چلیے 'عملی حیات' میں قواعد و ضوابط کی برکات سے ضرور فیضیاب ہوں کہ جیون سکھ مانگتا ہے اور فرد بھی طبعاً آرام طلب۔ البتہ کبھی کبھی طائر آرزو تو کرتا ہوگا نا کہ قوانین کے قفس سے کچھ دیر کے لیے اسے آزادی مل جائے! خدا کے پیغمبر بھی تنہائی میں چپکے چپکے ہم عصر شعرا کے اشعار گنگنا کر ایسے لمحوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں جن میں ایک بار تو تقید کی متداول اطراف رخصت پر روانہ ہو جاتی تھیں۔ ایک نئے زمان و مکان سے واسطہ سرشاری دان کرتا ہے۔ بھلے ہی یہ منظر نامہ سٹیٹ آف مائنڈ میں طلوع ہوتا تھا لیکن غروب ہونے سے پیشتر ایک نئی زیست کا عرق اس سے کشید کر لیا جاتا تھا۔ باقی رہے زندگی کے زمینی آسمانی تقاضے تو مکمل مفر کس سے ہو سکا!

مذکورہ پہلو کی مناسبت سے نوید شہزاد کی یہ نظمیں ذرا سی مزید توضیح کا مطالبہ کرتی

ہیں۔ نظم کے ساتھ ہی منتظم ہونے کی جہت
قلب میں از خود ترازو ہونے لگتی ہے، جیسے
یہ ضابطے میں سختی سے کسی بندھی کوئی شے
ہے۔ بے شک بحر بحری نظم کے یہاں پابند
ہونے کی تلقین اور عمل میں غلو بھی اپنا پورا اثر
دکھاتا ہے۔ نوید شہزاد اس باب میں حزم و
احتیاط سے کیوں بے پروائی برتے کہ اسے
متعلقہ آموختے ازبر ہیں۔ اس تعلق میں اس
کا شعری کنٹری بیوشن شاہد ناطق بھی ہے۔
مگر ان اسباق کو سر پہ سوار کرنے کے دباؤ
سے وہ ان معنوں میں آزاد ہے کہ وہ
بے قاعدگی کا مرتکب ہوئے بغیر اپنی سوچ
کے سچ کو بیان کر دینے پر ملکت رکھتا ہے۔
ہمیں اس صدق سے بھاگنا نہیں چاہیے کہ
تقطیع کے توسط سے مصرعے / شعر کی
Error Free پیمائش ہو سکتی ہے تو کیا
ہارڈ سٹک کی پرستش کا جواز پیدا ہو جائے گا؟
کیا قافیے / ردیف کی نقرئی دہلیز پر ماتھا ٹیکنا
ایک قدغن بن جائے گا؟؟

[مصرعیا! تیرے قافیے نوں میں کیہ کرنا؟]

آخر جذبہ و فکر بھی وجود رکھتے ہیں۔ وسعتوں
کے امین یہ سر پھرے بھلا رکن / ارکان کی ذکی
الحس شماریات سے کہاں مرعوب ہونا جانتے
ہیں! کناروں کی تعظیم غیر دریا کی مجبوری ممکن
ہے، دریا کی نہیں۔ سماج / ثقافت نے ابتدائی
میں اصول سازی کے نشے کے اندر اپنی بقا
ڈھونڈ لی تھی۔ ناسخ و منسوخ کے باوصف قانون
گری سے جدا ہو کر اسے جینا ہی نہیں آیا۔
کیا ’ملتبس اجتماعیت‘ کی تشکیل کے لیے سر
توڑ سعی اب بھی کوئی سر ہے۔ جی جناب! اسی
لیے ہر جینوئن صاحب تخیل / تخلیق کار کی
علاحدہ ملکیت اس سے برداشت نہیں ہو
پاتی کہ یہ مروجہ پہنائیوں کے عجیب جہان
کیوں رکھتا ہے! سوسائٹی / دھرم کے
آنکڑے سچے ادیب / شاعر پر کبھی محبس
کی تعزیر مسلط کرتے ہیں تو کبھی تحریص کا
خوش رنگ دام بچھاتے ہیں۔ لیکن ایک
اقلیت اپنا آپ صاف بچا لے جاتی ہے۔ نوید
شہزاد کو متذکرہ باشندوں پر مشتمل مختصر فہرست
میں دیکھنا تاثریت سے اس لیے موسوم نہیں
ہوگا کہ راقم اس کی نظموں: کھوہاں وی تریہ،
واشنا وا ھلکورا، ساہاں دی رجسٹریشن، چلھے
بیٹھاں راوی، تاریخ دی خودکشی، دھرمیانہ
روی۔۔ کو کہاں لے جائے! ان نظموں میں
ایک ایسے جری شاعر سے ملاقات ہوتی ہے
جس نے ’شعریت‘ کو قربان کیے بنا حریت
کے متنوع اشجار کو قطار اندر قطار دکھا کر ایک
بار تو متحیر کر دیا ہے! اب کوئی معروض پسند
نقاد چاہے اسے Gut Feeling کہہ
کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کر دیکھے لیکن

ایک خواندہ کی حیثیت سے یہ عاجز اپنے طرزِ احساس سے دستبردار ہونے کو فقد وقت آمادہ نہیں۔

''گیان دا لاسٹ سیشن'' نے اس لیے بھی مسرور کیا کہ شاعر نے ہر نظم کو اندر سے باندھ کر رکھا ہے۔ کسی لائن کو تفریق کر کے دیکھ لیجیے پورا متن ڈولنے لگے گا۔ فی الاصل ارتباط غیر مرئی رشتے کا سرنامہ ہے۔ اینٹوں کی چنائی کو تمثیل بنانے سے اس ماورائی بندھن کی تفہیم ہو ہی نہیں سکتی۔ نوید شہزاد نے لفظ کو لفظ سے آسرا فراہم نہیں کیا۔ وہ معنا کی سریت کو 'روح' بنانے پر عامل رہا کہ جانتا ہے روح ہمیشہ Indivisible رہے گی۔ جس قلب پر یہ مہربان ساعت کشف ہو کر چھا جائے: 'ہر پتے کا اپنا جنگل ہوتا ہے!' وہی قاری کے لیے اپنی نظموں کو گیان کے دریچے بنانے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اذہان پر طاری شب تاریک قندیل رہبانی سے تہی نہیں ہوا کرتی۔ یہ نظمیں اپنی ہئیت میں شاعری ہی کہلائیں گی مگر مفاہیم کے اعتبار سے یہ گیان چھلکاتی ہیں۔

اپنے اس بے ساختہ تاثر کا ملخص پیش کرنا چاہوں تو چند جملوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر نوید شہزاد کی اقلیم سخن میں اتار گی چونکہ اس عاجز کے سامنے ہوئی، یوں پورے اعتماد کے ساتھ عرض کیا جا رہا ہے کہ اب وہ پہلے سے بڑھ کر شگفتہ شالی کوی ہے۔ یہ حقیقت بھی ٹھہری کہ عمر و علم کی فزونی دانش کو نکھار دیتی ہے۔ سو، اس مجموعے کی ہر نظم ہی نہیں ہر سطر آزاد فکری فضا کا صلہ قرار پائے گی۔ نوید شہزاد نے صرف استزداد کی مدد سے اپنے نظمیہ متون کو ندرت سے معمور نہیں کیا۔ اس نے متباین حقائق سے گہری اور اوکھی جرأت اختیار کر کے متناقصہ کی معنویت کو جزوِ شعور بنانے کے لیے پیہم تگ و تاز کی۔ اسی لیے یہ نظمیں کسی متعین نظریے کی ترجمانی پر مامور نہیں ہیں۔ فکری بوقلمونی نے انھیں قاری کے لیے Panoramic بنا دیا ہے۔ خواندہ پڑھت کے دوران رنگوں کے ساتھ ساتھ شیڈز کے لطیف امتیاز سے بھی لطف کشید کرتا چلا جاتا ہے۔ واضح رہے یہ صورت حال شبدوں سے کہیں زیادہ معانی سے وابستہ ملے گی۔ نوید شہزاد نے نظم کے بسیط شعری قالب کو قائم رکھتے ہوئے جدید زندگی کے قضایا کو عمداً پند کی پرچھائیں سے بچا کر گیان میں ڈھالنا چاہا اور وہ بامراد ہوا۔ آخر میں یہ ضرور کہنا ہے کہ نوید شہزاد کی ان نظموں کا بنیادی اختصاص یہ ٹھہرے گا کہ تخلیقی سطح پر عزل و نصب کا عمل موثر ہوا ہے۔ شاعر نے لبھاونی غنائیت کو اس لحن سے تبدیل کر دیا ہے جس کا آہنگ سوچ کے بیج کو بیدار کرتا ہے!!

☆☆☆☆☆

تعبیر ہندسہ نہیں ___ تاثراتی تنقید کا مےخانہ

مشکل یہ ہے کہ جمیل احمد عدیل صاحب کا صرف اسلوب ہی منفرد نہیں علمی وسعت بھی ایسی ہے کہ ان کی تازہ ضخیم تصنیف ''تعبیر ہندسہ نہیں'' پر جب دو پیراگراف لکھ چکا تو مجھے ان کے مقابلے میں اپنی تحریر بہت پھیکی محسوس ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ میں نے تو اپنے تاثرات کا بس سادہ اور سچا اظہار کرنا ہے، کیونکہ میرے استاد سجاد حیدر (پنجابی ڈرامہ نگار) کہتے تھے کہ کتاب پڑھنے کے بعد اس پر کچھ نہ کچھ لکھا بھی کرو۔ کاش میں نے ان کی بات پر عمل کیا ہوتا تو آج عدیل صاحب یوں ہاتھوں سے پھسل پھسل نہ جاتے۔ عدیل صاحب کا اسلوب سیدھی لکیر نہیں، ٹیڑھی کھیر ہے۔ جو ستائش باہمی میں مبتلا ذیابیطس کے مریض اور اکہری نظر کے نقادوں کے لیے باعث شفا ہے۔ موضوعاتی طور پر عدیل صاحب کی دیگر کتب کے مطالعہ سے بھی صاف جھلکتا ہے کہ فکشن ہی بار بار ان کا دامن توجہ کھینچتا ہے، اور اسی باعث میری توجہ بھی عدیل صاحب پر لگتی رہتی ہے کہ فکشن سے ہماری محبت مشترکہ ہے۔ صرف فکشن ہی نہیں میں ان کے منفرد اسلوب سے بھی سیکھتا اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اس انفراد کے متعلق ان کا بیان ہے کہ ''جس نقاد کے ہاں انفراد موثر ٹھہرا وہ ریڈر سے کچھ الگ تربیت کا متقاضی رہا ہے'' جناب عدیل صاحب! آپ لکھتے رہیے تربیت ہو رہی ہے، اور ہوتی رہے گی۔

اعجاز روشن

فی زمانہ ادب میں جو تیزی در آئی ہے اور دھڑا دھڑ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ان میں یقیناً کچھ اہم بھی ہیں۔ لیکن وائے قسمت کہ بے توجہی کی گرد میں دبنے لگتی ہیں۔ لیکن پروردگار کسی کی محنت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے پروفیسر جمیل احمد عدیل اور ڈاکٹر اکرم کنجاہی جیسی سربرآوردہ، صاحب علم وقلم شخصیات کو بھیج دیتا ہے جو ان تخلیقات کو کشادہ دلی اور ژرف نگاہی کے ساتھ پذیرائی بخشتے، اور حسب مراتب جائز مقام دیتے ہیں۔

میرے مطالعے میں یہی شخصیات ایسی ہیں جو اکابرین کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی مان دیتی اور گم ہونے سے بچاتی ہیں۔ آج کے ادب کے لیے دونوں کا دم غنیمت ہے۔

یہی دیکھ لیجیے کہ عدیل صاحب کے متعدد مضامین پڑھ کر مجھے نہ صرف دیگر تنقید نگاروں اور افسانہ نگاروں کے نام سامنے آئے بل کہ ان کی تخلیقات، فکر، رجحانات اور نظریات سے بھی آگاہی ملی جس پر عدیل صاحب کا ممنون نہ ہونا ناشکری ہوگی۔ عدیل صاحب کی تنقید قاری اساس ہے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ اپنے سنجیدہ اسلوب سے ایک مثالی قاری پیدا کرنا یا اس کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ کہ عدیل صاحب چونکہ خود تخلیق کار ہیں لہٰذا کسی مجرد نظریے یا تصور کے اسیر ہوئے بغیر متن کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی گہرائیوں میں اتر کر معنی دریافت کرتے ہیں۔

عدیل صاحب کی دیگر کتابوں کے بامعنی اور دلکش عنوانات کی طرح زیر نظر تازہ تصنیف کا سہ لفظی عنوان ''تعبیر ہندسہ نہیں'' چادر کی وہ بکل ہے جس میں ایک گہرا معنی چھپا بیٹھا ہے۔ ''تعبیر ہندسہ نہیں'' کے بظاہر معنی یہی ہیں کہ تعبیر کا تلازمہ چونکہ خواب سے ہے، اور خواب کا تعلق جاگتی دنیا سے دور روح کی دنیا سے ہے، جبکہ ہندسہ جاگتی ہوئی مادی دنیا کی نس نس میں سرایت کر چکا ہے، لہٰذا ان میں بُعد پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عدیل صاحب کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں جو تخلیقات کی تعبیریں / تفسیریں کر رہا ہوں ان کا حاصل جمع دو اور دو چار نہیں، پانچ بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ معاملہ خیالات کے ساتھ ہے ہندسوں کے ساتھ نہیں۔ اور تیسرے لفظوں میں یہ عدیل صاحب کی انکساری اور عاجزی بھی ہو سکتی ہے۔

''جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی: ایک تجزیہ'' یہ اس کتاب کا پہلا مضمون ہے جو محمد حمید شاہد صاحب کے ناول کا عنوان بھی

ہے۔ یہ ناول میں پڑھ چکا تھا اور اس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی رائے بھی دے چکا تھا مگر اب جو عدیل صاحب کا عالمانہ تبصرہ پڑھا تو ناول کی مزید جہتیں اور گرہیں کھل کر سامنے آنے سے ناول پہلے سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوا۔ دوسرا مضمون ناصر عباس نیر صاحب کی تخلیقات بالخصوص افسانوں پر ہے، ناصر عباس نیرؔ کا میں نے غالباً کوئی افسانہ تاہنوز نہیں پڑھا جس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میرے ذہن میں کہیں یہ بات اٹکی ہوئی ہے کہ اچھا نقاد اچھا تخلیق کار نہیں ہو سکتا (اس کی وجوہ اس سے منسلک موضوع میں ہی بیان کرنا مناسب ہوگا)۔ لیکن عدیل صاحب نے ناصر صاحب کے افسانوں پر جس نوع کے تبصرے اپنے مضمون میں کیے ہیں وہ بطور افسانے کے قاری کے مجھ میں ان کی خوانگی کی للک کو تیز تر کرتے ہیں۔ کتاب میں دیگر کئی افسانہ نگاروں کا تعارف بہت خوش اسلوبی اور ادبی دبازت کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن ان فن پاروں پر عدیل صاحب کے مضامین کی جو اصل خصوصیت اور اہم عنصر ہے وہ فن پاروں کی اوپری سطحوں کی پڑھت سے گریز ہے۔ کوئی ناول نگار ہو، افسانہ نگار ہو، یا

شاعر ہو، وہ اس کے محض تذکروں تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان فن پاروں اور اصناف کی کنہ میں اتر کر ان کے تمام در و بست کو کھنگالنے کے بعد ہی اپنے عالمانہ بیان اور رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کا کسی ایک افسانے، یا کسی ایک ناول پر مضمون اس افسانے اور ناول کی محض تشریح یا خلاصے تک محدود نہیں رہتا بل کہ موجودہ عہد کے ادبی منظرنامے رجحانات اور سماجی حوالوں کے ساتھ آگاہ کرتا اور روشنی پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً ناصر عباس نیرؔ صاحب کے افسانوں کے متعلق جو مضمون ہے وہ خود فکشن پر بھی الگ سے ایک جاندار مضمون کی حیثیت رکھتا ہے جو فکشن کی نئی کروٹوں سے آگاہ کرتا ہے، گویا وہ خود کو متن کی واحد تعبیر تک محدود نہیں کرتے، اور نہ اپنی پسند کے معنی ڈالتے ہیں بل کہ وہ جسے ''متن کا منشا'' The intention of text کہتے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہیں اور متن کی تعبیر متن سے برآمد کرتے ہیں، اس ضمن میں مصنف کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ بقول اٹلی کے نقاد امبرٹو ایکو ''متن کی تعبیر کے لیے مصنف کی منشا تک پہنچنا بہت مشکل ہی نہیں بعض حوالوں سے

بے معنی بھی ہوتا ہے" ۔عدیل صاحب کسی جانبداری سے بھی کام نہیں لیتے۔ میرا جی نے کہا تھا کہ "ہم اپنے رسم ورواج کے قیدی ہیں ادب اور آرٹ کو جانچتے ہوئے ہم کوشش کے باوجود جانبداری سے رہا نہیں ہوسکتے" یہ بیان ایک شاعر کا تھا جو بہر حال نقاد نہیں تھا پھر شاعری کی دنیا میں گروہ بندیوں کے چلن سے کون واقف نہیں؟ لیکن آج کا نقاد ٹیکنالوجی کی جس جدید دنیا میں بس رہا ہے جہاں علمی جہتیں اور وسعتیں اتنی ہیں کہ نقاد کو جانبداری یا غیر جانبداری کی طرف جانے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ کسی نظریے یا تحریک سے وابستگی کے باعث نقاد، بلکہ تخلیق کار بھی اپنے مافی الضمیر میں تبدیلی لاتا رہے۔ تنقید اور تخلیق کی یہی کشمکش ادب کی اصل رونق ہے جس سے نئے راستے اور امکان پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم ان متغیر زاویوں کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔

ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کی تنقید کے حوالے سے مضمون "فکر انگیز تنقید کی مثال" آج کے انتقادی مزاجوں، زاویوں اور رویوں پر لکھا بھرپور مضمون ہے۔ عدیل صاحب نے جو بات ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے بارے میں لکھی ہے وہی خود ان پر بھی صادق آتی ہے کہ "انھیں نہایت لطیف فرق کو متعین کر لینے پر اتنا ملکہ حاصل ہے کہ شائبوں کے بیچ بھی لکیر کھینچ دیتے ہیں" اسی مضمون کے اخیر میں انھوں نے ایک جاندار انگریزی قول لکھا ہے جو غالباً ہم سب کے لیے ہے " A good critic always has the ability to discriminate the nuances in art works.

"مصنوعی ذہانت: حریف یا حلیف" فکر انگیز مضمون ہے جس کا عصری مسائل اور سوالات کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ایک یک سطری مگر جامع اقتباس ملاحظہ کیجئے:......"جس کا معمار بندہ بشر خود ہے اس سے ایک دم سہم جانا تو مناسب نہیں تاہم اس کے "شر" سے محفوظ رہنے کا بندوبست کرنا لازم ٹھہرا۔ دراصل جس بنیادی ماڈل پر ایجادات ہوتی آئی ہیں، اس میں "شر" موجود تھا۔ چنانچہ اس تخلیق / اختراع / ابداع کا انتظار ہے جو مطلق خیر ہو"۔ گویا عدیل صاحب ہمیں حوصلہ دیتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ جس طریقے یا راستے سے کوئی "شر" پیدا ہوتا ہے وہیں سے کبھی خیر کی کوئی ایجاد بھی ہو جائے گی

لہٰذا حوصلہ رکھیں۔ اکثر پڑھا اور سنا بھی گیا ہے کہ جہاں سے شر پیدا ہوتا ہے وہی خیر کا منبع بھی ہے۔

"تعبیر ہندسہ نہیں" تصنیف میں شامل مضامین بظاہر تو تنقیدی مضامین ہی ہیں مگر ہر مضمون کا علمی ذائقہ، وسعت اور گہرائی مختلف اور ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عدیل صاحب کے زیرِ قلم عصری اور ادبی مسائل کے علاوہ ممدوحین اور کتابوں میں بھی تنوع پایا جاتا ہے لیکن کہلاتے سب مضامین ہی ہیں۔ جس طرح "کھانا" ایک لفظ ہے لیکن اس کے اندر نمکین، میٹھی اور تیکھی ہر چیز آ جاتی ہے۔

راقم السطور جتنی بھی کوشش کر لے اس ضخیم کتاب کے سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتے محتویات کو اس محدود تبصرے میں قید نہیں کر سکتا کہ بھارت کے ڈاکٹر محمد انعام برنی سے لے کر خاکسار اعجاز روشن تک ان کی علمی وسعت کے لپیٹے میں آ گئے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین پڑھتے چلے جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ذہنی طور پر عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔ بس پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے۔ میں جب تک اس کتاب "تعبیر ہندسہ نہیں" کے جلو میں رہا مطالعے کی سرشاری میں رہا۔ اسی لیے میں نے اسے "تاثراتی تنقید کا مے خانہ" لکھا ہے جسے جرعہ جرعہ پیتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ لگے ہاتھ کیوں نہ مختصراً یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ تاثراتی تنقید ہے کیا؟۔ اس کا پہلا جواب تو اسی اصطلاح ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کسی متن پر تاثرات کا اظہار، تاثراتی تنقید کہلائے گا۔ لیکن آج کے ایک اہم نقاد جناب ڈاکٹر اورنگزیب نیازی اس کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں "یہ نقاد کے وہ تاثرات ہیں جو ایک فن پارے کے مطالعے کے دوران اس کے ذہن و دل پر مرتسم ہوتے ہیں۔ نقاد اپنے ان انفرادی تاثرات کو بعینہٖ پڑھنے والوں تک منتقل کر دیتا ہے"۔

آخر پر محترم جمیل احمد عدیل صاحب کو اس علمی و ادبی کتاب کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس کتاب سے ایک یک سطری اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں "زندگی کی سیمابیت بھلا کب معنی کو متحجر ہونے دیتی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ "تعبیر ہندسہ نہیں" ہوتی۔

☆☆☆☆☆

محمد سلیم طاہر کی یاد میں

محمد سلیم طاہر بھی رخصت ہو گئے۔ اس دکھ نے ہمیں ختم نہ ہونے والے کرب سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا خوبصورت شخصیت تھی اُن کی۔ شاعر، ادیب اور پی ٹی وی لاہور کے سابق سینئر پروڈیوسر پروگرامز کے طور پر اُنھوں نے اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو خوب نبھایا۔ وفات سے تین چار روز قبل ان سے ٹیلی فون پہ تفصیلی گفتگو ہوئی تو بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں ---- میں نے اُنھیں نئے آنے والے شعری مجموعے "ماتمِ یک شہرِ آرزو" کی اشاعت پہ مبارکباد بھی دی ----- عزیز دوست اور خوبصورت شاعر واصف سجاد بھی اس وقت میرے پاس ہی موجود تھے۔ واصف سے بھی وہ فون کال پر دیر تک محوِ گفتگو رہے-- یاد رہے غالباً دو برس پہلے واصف سے اُنھوں نے اپنی شاعری سے متعلق کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور پھر واصف نے اُن کے حکم کی تعمیل میں چند صفحات لکھ کر بھجوا بھی دیئے تھے--

درویش منش انسان محمد سلیم طاہر میرے پی ٹی وی لاہور کے عرصۂ ملازمت کے دوران کچھ مدت کے لیے کرنٹ افیرز ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ بھی رہے۔ نہایت شفیق اور ہمدرد انسان تھے۔ اُسی عرصہ میں پی ٹی وی کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر جب میں نے پروڈیوسر کرنٹ افیرز کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو مجھے اپنے پاس بلا کر پہلے چائے پلائی پھر کہنے لگے ناں یار ایسا نہ کرو اور اپنا فیصلہ واپس لو اور سمجھاتے ہوئے کہنے لگے آپ ایک ایسے ادارے سے منسلک ہیں جس سے وابستگی ایک اعزاز ہے اُن کی مخلصانہ رہنمائی کی روشنی میں

علی رضا

مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔
انھوں نے کرنٹ افیئرز ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیں اور کنٹریکٹ پر کام کرنے والے پروڈیوسرز کی عزت افزائی کرتے ہوئے نہ صرف انھیں انفرادی طور پر پروگرام پروڈیوس کرنے کی ذمہ داریاں سونپی بل کہ انھیں اپنی اہمیت سے آگاہی بھی دی۔ وہ پروگرامز میں بڑی بڑی اہم شخصیات کی آمد پر بھی کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوتے اور ایک خاص حد تک اُن کو عزت و احترام دیتے۔ ہم نئے پروڈیوسرز کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے اور دوستانہ ماحول میں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران ہر طرح کی رہنمائی کرنے کے عملی اقدامات کرتے اور اس طرح کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی کا احتمال نہ رہتا۔
محمد سلیم طاہر ہمارے محترم دوست، معروف شاعر و خاکہ نگار اعجاز رضوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ جن دنوں وہ پی ٹی وی لاہور میں ہیڈ آف کرنٹ افیرز کی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے اعجاز رضوی تواتر سے اُن کے پاس آنے والوں میں شامل تھے اور سلیم طاہر بھی اُن کے منتظر رہتے۔ وہ ایک تہذیب یافتہ اور مہذب شخصیت کی مضبوط شناخت کے ساتھ احباب کے دلوں میں مقیم رہے
خوب صورت لہجے کے نہایت عمدہ شاعر اور نہایت وضعدار انسان تھے۔ اُن کے شعری مجموعوں میں کہرام (اردو)، تانگھ تریل (پنجابی) اور ''ماتمِ یک شہرِ آرزو (اردو) شعری تخلیقی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے ---''ماتمِ یک شہرِ آرزو'' اُن کی وفات سے چند روز قبل ہی منظرِ عام پر آیا۔۔ وہ جب تحت اللفظ میں شعر سُناتے تو ماحول پر نہ صرف خوش کُن کیفیات طاری ہو جاتیں بل کہ پورے پنڈال سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ اُن کی شاعری میں جو مضامین آئے وہ نہایت منفرد، اُچھوتے انداز اور دلفریب پیرائے میں بیان ہوئے۔۔اس حوالے سے چند مثالیں دیکھیں ----

میں تجھ سے اپنا تعلق چھپا نہیں سکتا
جبیں سے کیسے مٹا دوں ترے نشان کو میں

آئے ہو ابھی ٹھیک سے بیٹھے بھی نہیں ہو
یہ کیا کہ ابھی سے تمھیں جانے کی پڑی ہے

ملنے والوں کے پاس وقت نہیں
سر جھٹک کر گزار تنہائی

اُس نے حدیثِ دل کو ہوا میں اُڑا دیا
میں چٹکیوں میں مسلی ہوئی آگہی تھا بس

قفس کی چاردیواری میں اب میں مطمئن ہوں
حوادث صاحبِ اولاد بھی ہو جائیں تو کیا

خاک اُڑتی ہے اب درِ دل پر
آپ نکلے ہیں اس مکان سے کیا

وہ عام سے خیالات کو دلکش اور دل نشیں انداز میں ڈھنگ سے بیان کر کے خاص بنا دیتے۔ وہ سراپا شاعر تھے اور عمر بھر شعری تخلیق ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ معاملاتِ محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں، ناآسودگیوں اور محرومیوں سے جڑے ہوئے مضامین کو اُنھوں نے جس طرح شعری قالب میں ڈھالا ہے وہ اُن کے تخلیقی حُسن کا ثبوت ہے۔

شعبہ حالاتِ حاضرہ کے عرصہ ملازمت کے دوران سلیم طاہر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران ایک روز معلوم ہوا کہ گذشتہ رات ہارٹ اٹیک کے سبب پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی لاہور میں جا پہنچے ہیں۔ میں جب اُن کی عیادت کے لیے وہاں پہنچا تو بہت خوش ہوئے اُن دنوں ہمارے میٹرک کے دور کے دوست ڈاکٹر ذوالفقار وہاں تعینات تھے لیکن اُن سے رابطہ کافی عرصہ سے نہیں تھا۔ وہاں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہیں ہیں اور مارننگ میں ہوتے ہیں اس سلسلہ میں جب ان سے رابطہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسی وارڈ کے انچارج ہیں جہاں سلیم طاہر داخل ہیں میرے کہنے پہ اُنھوں نے سلیم طاہر صاحب کا خصوصی خیال رکھا جس کا تذکرہ سلیم طاہر صاحب نے بعد میں مجھ سے کیا اور کہا کہ آپ کے دوست نے میرا بہت خیال رکھا۔ جناب سلیم طاہر کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کی اتنی جہتیں ہیں جن کا تذکرہ چند صفحات میں نہیں سما سکتا مجھے چھیسے ہی واصف سجاد نے ان کے سانحہ ارتحال کی خبر دی میری آنکھوں کی نمی لفظوں کا روپ دھار کر اس مختصر تحریر میں منتقل ہو گئی دعا ہے کہ اللہ پاک اُن کی اگلی منازل آسان کرے اور اُن کے درجات بلند فرمائے۔ اُنھی کی ایک غزل کے چند اشعار پر اپنی یہ مختصر تحریر ختم کرتا ہوں۔۔۔

دریا تھا مگر ایسی روانی میں نہیں تھا
خود سر میں کبھی اتنا جوانی میں نہیں تھا

ہر واقعہ منسوب تھا میری تگ و دو سے
لیکن مرا کردار کہانی میں نہیں تھا

یکتائی نے قیمت مری منہ مانگی بڑھا دی
مہنگا میں کبھی اتنا گرانی میں نہیں تھا

میں شہر کی دیوار سے لگ کر نہیں بیٹھا
رکنا تو میری نقل مکانی میں نہیں تھا

ہر نقل کبھی اصل سے بہتر نہیں ہوتی
یوسف کا مزہ یوسفِ ثانی میں نہیں تھا

کیوں تلخ ہوا ہے مرا یہ لہجہ شیریں
اتنا تو نمک آنکھ کے پانی میں نہیں تھا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خورشید رضوی: اردو شاعری کا کہستانِ پامیر

ڈاکٹر خورشید رضوی کی شخصیت اور شاعری اردو ادب کا کہستانِ پامیر ہے، جہاں تہذیبی اور تخلیقی صلاحیتوں کے عظیم ترین پہاڑی سلسلے یکجا ہوتے ہوئے ایک ایسی سطحِ مرتفعِ سخن میں تحلیل ہو جاتے ہیں، جو اپنے تخلیقی جغرافیے میں پُر جمال اور بے مثال ہے۔ اس فضا میں چلنے والی ہوا نت نئی خوشبوؤں سے نہال ہے۔ اس کے دامن میں پائے جانے والے پھل، پھول اور اس کا حسنِ فطرت نہایت نرالا، کمیاب اور شاذ ہے ـــــ ایسا کہ جس کے ہر سنگ میں کوئی ساز اور ہر برگِ گل میں کوئی راز۔ یہ سخن کی وہ ہمہ صفتی ہے، جس کی مثال اردو شاعری کے وسیع منظرنامے میں خال خال ہی ملتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزلیہ شاعری ایک ایسے سنگم کی حیثیت رکھتی ہے جہاں کلاسیکی غزلیہ شاعری کے لوازمات، روحِ عصر سے دوطرفہ تفاعل رکھتی، قلبی، ذہنی اور نفسی سطحوں پر نموگیر و مُستنیر تخلیقی واردات اور عظیم اور آفاقی شاعری کی بنیادی خصوصیات بے ساختگی سے یکجان و یکجا ہو کر جدید اُردو شاعری کے منظرنامے میں ایک منفرد اور بے مثال موجودگی تخلیق کرتی ہیں ان کی بیشتر تخلیقات فلسفہ آمیز شاعرانہ گہرائی سے معمور ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت پُر کار سادگی سے بھی بھرپور ہیں جو زندگی کے جلوہ ہائے بیرون، وجود کے رازہائے اندرون اور انسانی جُون

علی ارمان

کی حرکیات اور انسانی تجربات کے مضمرات کی پیچیدہ کھوج کرتی ہیں اور قاری کی زندگی میں ماورائے حیاتیات و طبیعات کے پُراسرار رنگ بھرتی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں علمی عمق اور ایک نشاط انگیز حُزنیہ جذب پورے فنی جاہ و جلال اور شاعرانہ جمال کے ساتھ نمایاں ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری جذبات کی عالمگیریت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جہاں محبت، جدائی، حیرت، ناسٹلجیا، دنیا سے صوفیانہ بیزاری اور روحانی بیداری جیسے موضوعات ایک نشاط انگیز حُزنیہ تخلیق کرتے ہیں اور زمان و مکان و زبان اور ثقافت کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے مختلف پس منظر رکھنے والے دلوں کو جوڑ دیتے ہیں۔ یعنی آسان لفظوں میں ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب حرارتِ دل، سوزِ دماغ اور خونِ جگر کی ایک ہی خم میں تخمیر کر کے اس سے مئے نابِ سخن کی نادر و نایاب تجسیم کرتے ہیں اور تشنگانِ شعر میں تقسیم کرتے ہیں۔

جو چیز انھیں مزید منفرد بناتی ہے وہ سچے موتیوں جیسی انتہائی پُرتاثیر زبان سے تخلیق شدہ ان کا پیراڈوکسیکل اسلوب ہے، جہاں کلاسیکی طرزِ اظہار کی شائستگی بے ساختگی کے ساتھ جدید اظہار کی قابلِ تعظیم تازگی میں ضم ہو جاتی ہے۔ یہ دو پرتی تخلیقی فرزانگی اور کیفیاتی دوگانگی ان کی شاعری میں ایک جاودانی اور لازمانی روح پھونک دیتی ہے جو کلاسیکی ادب کے کشتگان اور جدت کے متلاشیان دونوں کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔ ان کے شجرِ شعر کی شادابی اس کا آشکار ثبوت ہے کہ ان کی شاعری کی جڑیں عربی اور فارسی کے رودہائے عظیم سے سیراب ہوتی ہوئی اردو کی کلاسیکی روایت میں گہرائی تک پیوست ہیں۔ تاہم، اس گھنیرے شجر کی شاخوں کی کتر بیونت ان کے اسلوب کو خورشیدانہ خوش سلیقگی کے ساتھ عصری آب و ہوا سے جوڑے ہوئے ہے۔ اس کا مظہر یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی کتاب کی اشاعت سے لے کر آج تک ہر نئی نسل کے اصیل قارئینِ شاعری میں اسی پُرتعظیم شکوہ کے ساتھ مقبول ہیں، جیسے وہ 'شاخِ تنہا' کی اشاعت کے فوراً بعد مقبول ہوئے تھے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کی شاعری کے حوالے سے کہستانِ پامیر کا استعارہ ایک غیر معمولی معنویت رکھتا ہے۔ جس طرح کہستانِ پامیر عظیم الشان پہاڑی سلسلوں کے سنگم کا مقام ہے، اسی طرح خورشید رضوی صاحب کا اسلوبِ شعر جدید و قدیم، خیالات و جذبات، دل و دماغ اور روایت و جدت کے امتزاج کا وہ افقِ عجیب ہے جہاں سے ہر مصرعہ خورشید طلوع ہوتا ہے۔ خورشید

صاحب کا ہر شعر کسی نہ کسی سطح پر ایک پرت در پرت گہرائی اور پیچیدگی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے مگر ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار میں سطحی ہوئے بغیر اس تہہ داری کو اپنے قاری کے سینے تک ایک سادہ و دلنشین و دل سوز شاعرانہ لطافت کے ساتھ منتقل کر دیتے ہیں۔

میرے خیال میں ہر زبان کا قابلِ ذکر اور بڑا تخلیق کار اپنی زبان و تہذیب کے رفتہ سے روشنی کشید کرتے ہوئے اس میں اپنے خونِ جگر سے نمو یافتہ تخلیقی چکا چوند کو آمیختہ کرتا ہے، اور یوں اس زبان کے ادبی، لسانی، تخلیقی اور تنقیدی مستقبل کو تابناک بنا دیتا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہی ادب، شعر اور تنقید کا صراطِ مستقیم اور نکتہ اعتدال ہے۔ خورشید رضوی صاحب شاعری کے اسی صراطِ مستقیم پر کسی قطب مینار کی طرح ایستادہ ہیں، جو نہ صرف پیچھے سے آنے والے بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کا ذریعہ ہیں بلکہ اپنے آگے کے راستوں کو بھی روشن کرتے ہوئے سچے جویانِ عترتِ شعر کو راستہ دکھا رہے ہیں۔

یہ تمام انسلاکات و امتزاجات ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کی تخلیقات میں ہم آمیز ہو کر ایک ایسا شعری منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں جو بیک وقت وسیع و عمیق، روایتی مگر جدید اور گہرے فلسفیانہ و فکری آہنگ مگر دل گداز جذباتی و کیفیاتی رنگ سے مزین ہے اپنی تخلیقی واردات کا یہ انفراد انھیں اردو شاعری میں منفرد مقام عطا کرتا ہے اور انھیں اردو کے ایک اہم شاعر کے مقام پر فائز کرتا ہے۔

جب کسی بھی زبان کا شاعر اپنی شاعری میں ایسی منفرد اور مشکل اسلوبیاتی، خیالاتی، موضوعاتی اور کیفیاتی آمیختگی کا تجربہ کرتے ہوئے اپنے اسلوب و اظہار کے تار و پود بنتا ہے، تو زبان و تخلیق کے ایک بڑے دھارے سے جدا ہو کر اس کے شاخِ دریا ہو جانے کا خطرہ تو لاحق ہوتا ہے۔ مگر جو ایک سچی واردات کا حامل اصیل شاعر ہو وہ اپنے اس منفرد بہاؤ کو شاعری کی آفاقی ہیئتگی کے بحرِ بے کنار سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ خورشید رضوی صاحب کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے۔

جدت کے جسم میں روایت کی روح پھونک کر موضوعات، احساسات اور خیالات کے تاریک گوشے منور کرتے ہوئے خورشید رضوی نے ایک ایسی شعری میراث تخلیق کی ہے جو اردو ادب کے جغرافیے میں کہستانِ پامیر کی طرح پرشکوہ، لازوال اور بے مثال ہے۔

☆☆☆☆☆

دھیمے لہجے کا شاعر، عاشق جعفری

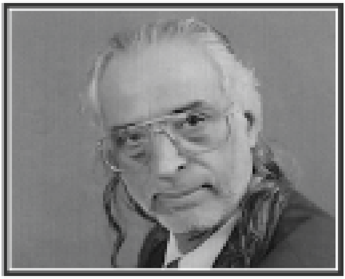

قدر پھلاں دا بلبل جانے جیڑی صاف دماغاں والی
قدر پھلاں دا گرج کی جانے مردے کھاون والی

....

سرزمین پوٹھوہار خطۂ کشمیر کا صحن ہے۔ کشمیر جہاں فطرت نے اپنے حسن و جمال کے تمام بندِ قبا کھول کر رکھ دیے ہیں۔ اس کی زلفوں کی گھٹائیں لہرا لہرا کر اُس کے لب و رخسار کو چھیڑتی ہیں، اُس کے بدن سے کھیلتی ہیں اور جس کی گلابی مٹی کسی گلال ہوتی ہوئی دلہن کا روپ پیش کرتی ہے، جس کی شاداب فضا دلوں کو گداز بخشتی ہے۔ جس کے جنگلوں کی معطر ہوا اس طرح شانتی دیتی ہے کہ:

روح تک آ گئی ہے تاثیر مسیحائی کی

....

سندھ دیس کا خوبصورت "سر" جسے یونانیوں نے کشمیر کہا۔ ایرانیوں نے اسے کشمیر کا نام دیا۔ قدیم اساطیری ادوار میں سندھیوں نے اسے "دُستی سر" کے نام سے پکارا، سندھ کے وجود کا پُرسکون سر جہاں آسمان موتی برساتا ہے یہ آبِ حیات یہ امرت دھارا سندھ کے سینے پر بہہ کر اُسے زندگی بخشتا ہے جو قدیم اور عظیم تہذیبوں میں قیام کرتا ہے جہاں جوگی سکون لیتے ہیں، جہاں بھگت اُس کی گپھاؤں میں نروان لیتے ہیں اور اُنھیں بھگوان درشن دیتا ہے۔ اساطیری دور میں دیوتا اترتے ہیں۔ بھلائی کو عام کرتے ہیں بدی کو شکست دیتے ہیں، راون سیتا کی کھوج میں آتا ہے رام اپدیش دیتا ہے، ہنومان کا جلال لنکا پھونک دیتا ہے، اذیت تمام کرتا ہے، جہاں زعفران اُگتا ہے داستانیں خوشبو دیتی ہیں۔ حوصلوں کو جلا دیتی ہے۔

اسی دھرتی سے تعلق رکھنے والے میاں محمدؒ بخش صاحب بہت بڑے اپدیشک ہیں جن کی تخلیق "سیف الملوک" زندگی کی رہنمائی کرتی ہے، دلوں کو صاف کرتی ہے اور دماغوں کو روشن۔ اس درویشِ کامل کی زندگی کے تمام اسالیب دلوں کو مسخر کرتے

رومانہ رومی

ہیں، جہان کو منور کرتے ہیں کفر کو توڑتے اور دلوں کو جوڑتے ہیں اور عشقِ رسالتؐ ان کے ماتھے کا جھومر ہے۔

قدر نبیؐ دا اے کی جانن جیہڑے دنیا دار کمینے
قدر نبیؐ دا جانن والے سوں گئے وچ مدینے

......

اپنی ذات کی نفی اور دنیا کی ریاکاری کا پردہ چاک کرتے ہوئے راست منزل کی نشاندہی اس طور کرتے ہیں:

اِسی خطہ پوٹھوہار کی سرزمین پر عاشق جعفری نے جنم لیا اور اِس عظیم وراثتِ اظہار سے فیض پایا اور اِسی فیض کے سبب انھوں نے وراثتِ اظہار سے ملنے والا حصہ لیا ہے جو انھوں نے اپنے اردو اور پنجابی کے مجموعوں کی صورت میں زمانے کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان کے ہاں گنجلک خیالی اور لفظی پیچیدگی سے گریز کی صورت پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب اظہار سادہ ہے اور وہ سیدھے اور گداز انداز میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں جیسے کوئی حیا کے تمام تر پہلو برت کر سرگوشی کر رہا ہو، یہ دکھ کا اظہار ہو یا کوئی شکوہ شکایت، ان کا لہجہ دھیما اور گداز اسلوب کا آئینہ ہے ان کے شعر ملاحظہ ہوں:

اب ذرا احتیاط لازم ہے
تیر ہم پر نیا چلانے میں

......

جب بھی کوئی شریکِ سفر یاد آیا
حسرت سے میں نے دیکھا پرندوں کی ڈار کو
میں آج بھی دعاؤں میں کرتا ہوں اُس کو یاد
جو شخص اپنے وعدے سے عاشق مکر گیا

......

لوگوں نے سارے پھول ہی دامن میں بھر لیے
میں ساتھ لے کے آ گیا گلشن سے خار کو

......

آخری شعر میں اُنھوں نے جو بھی کہنا چاہا ہو وہ تو وہ جانیں، ہماری دعا ہے کہ اُن کا یہ شعر اُن کی بیگم کی نظر سے نہ گزرے ورنہ اُنھیں ان کے جلال کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ بہرحال، قہرِ درویش بر جانِ درویش۔

یادِ وطن کی کسک اور تلاشِ رزق کی مجبوری کو انھوں نے کس خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ ان کا یہ شعر دیکھیے:

عمر ساری گزار دی ہم نے
رزق اپنا یہاں کمانے میں

......

کسی طرح سے مرے دل کو ٹوٹ جانا تھا!
تری جدائی تو اے دوست اِک بہانہ تھا

......

عذر رکھا ہے کب کہاں ہم نے
حالِ دل تجھ کو پھر سنانے میں

......

بے وفاؤں سے وفا کیسے کریں
زندگانی کو سزا کیسے کریں

......

آپ سے عہدِ وفا باندھا ہے جب
آپ کہیے ہم جفا کیسے کریں

سامنے ہو تم نظر کیسے اُٹھے
ساری محفل کو خفا کیسے کریں

اب تیری وفا نے مجھے پابند کر دیا
دیوانے کے لیے کوئی زنجیر مل گئی

جس طرف دیکھ لے قیامت ہے
کوئی جادو سا اس نظر میں ہے

ان کی شوخی کے رنگ کس طرح کھلتے ہیں ذرا کلام دیکھیے:

ان کی محفل تک رسائی ہو گئی
اس طرح میری خدائی ہو گئی

دیکھا چمن میں ہم نے یہ بادِ صبا کے ساتھ
چہرہ مہک رہا تھا تمھارا گلاب میں

یہ دل ہمارا پھول کی صورت نہ کیوں کھلے
دو بول پیار کے جو کہو تم جواب میں

ہے رمزِ عاشقاں عاشق، کسی کو کیا خبر اس کی
کہ کن آنکھوں کی مستی میں، اشارے اور ہوتے ہیں

اسی طرح ان کے خوب صورت پنجابی مجموعہ کلام "رتے پُھل وچھاون" کا جائزہ لیں تو وطن کی یاد کی چسکی کو اس طرح بیان کیا ہے:

رنگ برنگے بُوٹے ویکھے لندن تے برمنگھم
پھل نہیں سکیا سانوں بچیاں امیاں والا وہ بُور

غلامی اور جبر کے خلاف نبرد آزما اپنے بھائیوں کے ساتھ کبھی وہ کھڑے نظر آتے ہیں اور دیارِ غیر میں بھی جابر کا پیچھا کرتے اور اس کی روسیاہی کو اُبھارتے نظر آتے ہیں:

پُیریں زخم غلام والے، گل وچ پاٹیاں لیراں نیں
منظر منظر اکھاں لگے لہو رنگیاں تصویراں نیں

کیدوورگے وَیری سارے، ہاہواں سُن سُن کہندے نیں
آزادی لئی بیلے اندر، کیوں کرلاٹیاں ہیراں نیں

دُکھ کے اظہار کے ساتھ حوصلہ اور اُمید کا اظہار ان کا یقین اجتماعی جدوجہد اور اجتماعی تیقن بنتا نظر آتا ہے۔

سُو سُو واری صدقے جاوَن بھیناں اج وی اوہناں تے
دھرتی اُتوں جان اواری جیہڑے انکھی ویراں نیں

چُھپ ہنیرے چیرے اِک دن جھنی پا کے ملکن یاں
ساڈے اُتے قسم خدا کی عاشق ایہہ تنویاں نیں

سماجوں کے مشاہدے سے جو اخذ کیا وہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کر کے حال فقیراں اتھے
گوریاں تے سکیں ٹھہر دیاں

سخن ور سخن شناسوں کا سرمایہ ہوتے ہیں اور یہ سرمایہ دارانِ سخن، وارثانِ سخن سے لطف اُٹھاتے رہیں گے اس طرح سخن ور زندہ رہتے ہیں میں اس بات کو عاشق جعفری ہی کے اس شعر پر ختم کرتی ہوں کہ:

عاشق کھڑی شریف دے کہندے
سخن دے وارث زندہ رہندے

☆☆☆☆☆

"تصورِ ممدوحِ کائنات" اور تصور اقبال

تحریر کے آغاز سے قبل ایک نظر معروف نقاد ممتاز حسن کی اس رائے پر ڈال لیتے ہیں جو انھوں نے نعت کے حوالے سے فرمائی ہے اور جو نہایت بلیغ، وقیع اور اہم ہے کہ "ہر وہ شے نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت للعالمین کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے۔ نعت میں یہی صورت موضوعات اور مضامین کی ہے، یعنی ہر وہ موضوع یا مضمون جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات، سیرت یا صفات کا کوئی نہ کوئی حوالہ آجائے نعتیہ کلام میں شامل ہے، یا ہر کوئی موضوع، وہ معاشرت اور تمدن سے متعلق ہو یا معاشیات و اقتصادیات، تہذیب و ثقافت سے متعلق ہو یا عمرانیات و سیاسیات سے جسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے قلمبند کیا جائے نعت کا موضوع ہوگا، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ ایک ایسا مقناطیس ہے جسے مس کرنے والا ہر موضوع نعت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

برادرِ مکرم تصور اقبال کے نام اور کام سے کم و بیش دو عشروں کی آشنائی ہے۔ میرے ذہن و دل میں اُن کی شخصیت کا ایک مجموعی تاثر یا تصور غزل کے خوش کلام اور راست فکر شاعر کا رہا ہے۔ نثر بھی عمدہ لکھتے ہیں، تاہم ہماری آج کی گفتگو ان کی نعتیہ شاعری سے متعلق ہے اور بالخصوص تازہ نعتیہ شعری مجموعہ "تصورِ ممدوحِ کائنات" زیرِ گفتگو رہے گا جو ان کا ماشاءاللہ چوتھا مجموعۂ نعت ہے۔ لیکن بات شروع کرنے سے پہلے کچھ اظہارِ خیال اس نکتے پر بھی ضروری ہے کہ کتاب کے اکثر مقامات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے عملاً غزل گوئی ترک کر دی ہے اور اب وہ فقط نعتیں ہی کہا کرتے ہیں۔ میں نے یہ جان کر ایک نظر اُن کی غزلیہ شاعری پر از سرِ نو

محمد آصف مرزا

ڈالی تو میرا یہ اولین تاثر مزید گہرا ہو گیا کہ ان راست فکرِ شاعری تو یوں بھی اپنے تدریجی اور ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی از خود سرزمینِ حمد و نعت کی جانب رواں دواں تھی بل کہ ہے اور مجھے کسی سخن شناس بل کہ یوں کہیے کسی نعت شناس کی یہ بات بھی یاد آئی کہ اگر غزل کہتے ہوئے کوئی شعر نعت کے رنگ میں ڈھل جاتا ہے وہ نعت ہی کا شعر ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کے ایک مجموعے "گلاب بعد آب" کے پسِ ورق پر ڈاکٹر سید قاسم جلال کا یہ تبصرہ نظر سے گزرا تو مجھے کچھ یقین آیا کہ خیالات کی رو میں جہاں سے گزر رہا ہوں، اکیلا نہیں ہوں، بل کہ میرے ہم نوا اور بھی ہیں --- ملاحظہ فرمائیے ---

"ان کے افکار پر اسلامی افکار کا رنگ غالب ہے جو قاری کو لگا ہے گا ہے زندگی کی اعلیٰ اور مثبت قدروں کی طرف راغب کرتا ہے۔ فکرِ صالح کی مہک ان کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ ایسی مہک جس سے دل معطر اور مشامِ جاں مشک بار ہو جاتے ہیں۔

"تصور اقبال کی غزلیں ان کے اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے والے اشعار سے معمور ہیں۔ ایسے اشعار کثرت سے لکھنے والے شاعر کو بے شبہ "شاعرِ صداقت شعار" کہنا چاہیے۔"

آپ کو تصور اقبال کی غزلیہ شاعری سے کم از کم دو اشعار تو یہاں پیش کر ہی دیے جائیں تا کہ اوپر کہی گئی بات کی توثیق و تصدیق ہو جائے اور معلوم ہو سکے کہ ان کی غزلیہ شاعری بھی غیر محسوس انداز سے اپنے لیے کیا رُخ متعین کر رہی تھی:

ہوا کا بھی گزر ہے روشنی بھی اس سے ملتی ہے
اذاں بھی اب سنائی دے رہی ہے اک دریچے سے

....

الہام کی صورت میں اُترتے ہیں ہمیشہ
اک شعر بھی بھرتی کا یہ حامل نہ ملے گا

....

آپ کی ان کی ساری غزلیں پڑھ جایئے اور مجھے ایک شعر بھی ایسا بتا دیجیے کہ جو غزل کے روایتی، سستے اور پوچ جذبات کی نمائندگی کرتا ہو۔ آپ کو خود تصور اقبال کے بقول ایک بھی شعر بھرتی کا حامل نہ ملے گا۔

شہر طراز صاحبہ نے ایسی خوب صورت اور معنی خیز بات ایسے ہی تو نہیں کہہ دی کہ "لیکن میرے نزدیک نعت گوئی کا شرف قسمت والوں کو ملتا ہے۔ میں تو کہوں گی کہ پاکیزہ شاعری ہی بالآخر نعت گوئی کی طرف مائل کرتی ہے۔"

اور محترمہ صوفیہ بیدار کا کہنا ہے کہ ---

"نعت گوئی ہنر نہیں سعادت ہے اور یہ سعادت ہر کسی کو حاصل نہیں۔

اور پھر تخلیقِ فن کے کسی ایسے ہی لمحہ مبارک میں تصور اقبال کے جی میں یہ بات آ گئی کہ اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے ---

مرے اوپر ہوا لطف و کرم کچھ اس طرح اُن کا
غزل سے یہ نگہ پھیری اسی مدحت کی برکت سے

....

اور اپنا رشتہ بہ تمام و کمال، دامنِ مصطفیٰ ہی سے جوڑ لیا۔

نعتِ نبی ہی آج کی تاریخ میں لکھوں
باقی کے کام جا رہا ہوں کل پہ ٹال کے

یوں تصوّر اقبال نے شاعروں کے اس محترم و مکرّم قبیلے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا جس میں مولانا احمد رضا خان، حفیظ تائب، حافظ مظہر الدین اور فیض لدھیانوی سے لے کر جمشید چشتی، صبیح رحمانی اور سرور حسین نقشبندی جیسے متعدد اسمائے گرامی جگمگا رہے ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے لیے خود کو مخصوص کر لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ مملکتِ نعت کی طہارت و تقدیس بھری فضا میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی صوفیانہ انداز کی شاعری کی بدولت درِ نعت پر تو قیام پذیر تھے ہی اور یہ کہتے ہوئے گویا ایک اونچی پرواز کے لیے پر تول رہے تھے---

یہ پرندے کے کسی دن لگ گئے جو خیر سے
ہم بھی جا بیٹھیں گے واں مسجد کے اِک مینار پر

....

تصوّر اقبال نے اپنے نعتیہ مجموعوں کے نام سوچتے ہوئے، اپنے نام سے خوب، خوب کام لیا ہے۔ ''تصوّرِ جرا''، ''نُور کے تصوّر میں''، ''تصوّر میں مدینہ ہے'' اور تازہ ترین مجموعۂ نعت، ''تصوّرِ ممدوحِ کائنات'' جو موصوف کا چوتھا مجموعۂ نعت ہے اور معنی آفرینی میں گزشتہ مجموعوں سے بڑھ کر ہے۔ اس مجموعہ میں ایک حمد اور تریسٹھ نعتیں شامل ہیں۔

تصوّر اقبال کے ہمراہ اب چار عدد نعتیہ مجموعوں کا تجربہ بھی ہے اور یوں بھی وہ اسلامی اور اخلاقی اُفتادِ طبع کے اعتبار سے نعت کہنے کے لوازم اور آداب سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اُنھیں یہ ادراک حاصل ہے کہ نعت کہنا کتنا کٹھن اور نازک کام ہے۔ ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر جُنید و بایزید جیسی برگزیدہ ہستیاں بھی جیسے اپنا نفس گم کر بیٹھتی ہیں۔

کر رہا ہے مدحتِ خیرالوریٰ اقبال جو
یُوں سمجھ لے چل رہا ہے وہ کسی تلوار پر

....

تلوار پر چلنا آسان نہیں ہوتا، چلنے والا سرِ مُو بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو جادۂ اعتدال سے کوسوں دُور جا پڑتا ہے۔ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وافر نعمت سے سرفراز لوگ ہی یہاں سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔ اور آسانی سے گزرتے بھی کہاں ہیں؟ وہیں ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

....

اور تصوّر اقبال کہنے سے پہلے اس اہتمام سے یُوں گزرتے ہیں:

عشقِ نبی میں ڈوب کے لکھتا ہوں نعت میں
ہوتا ہوں باوضو جو کروں اُن کی بات میں

....

یہ طے کر چکنے کے بعد کہ اب اُنھیں نعت ہی کہنی ہے اُنھیں ایک نوع کی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ گویا شرحِ صدر سے کہہ اُٹھتے ہیں۔

نعت کا اِذن مجھ کو عطا ہو گیا
دل خرافات سے اب رہا ہو گیا

....

اب یہی سوچ اور یہی حسرت ان کے دل میں جاگزیں ہے۔

تمنا بس یہی ہے اب یہی اک دل میں حسرت ہے
مرا بھی نام آئے آپ کے مدحت نگاروں میں

....

تصوّرِ اقبال نے اپنے لیے جو فضا اور ماحول تخلیق کیا ہے اُن میں ہر جانب اب نعت کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، اُن کا گلستانِ نعت اب ہر گھڑی معطر ہوا جا رہا ہے۔

بن گیا ہے پھول وہ نعتِ نبی کا خوشنما
اک کلی مدحت کی میں نے دوسری سے جوڑ دی

....

نعتِ نبی کے پھولوں کا اک مہکتا ہار ہے جس کے حِصار میں وہ سرشار رہے ہیں۔

یہ دنیا مری جو بدل سی گئی
ہے نعتِ نبیؐ کا یہ سارا اثر

....

وہ ایک نعت کہہ کر جب کچھ توقف کرتے ہیں تو ایک اور نعت کے بول اُن کے لبوں پر چمک اُٹھتے ہیں۔

تصوّر مری خوش نصیبی یہی ہے
مرے لب پہ ہر وقت نعتِ نبی ہے

....

ملی ہے جو مدحت سرائی کی دولت
مجھے اب کسی چیز کی کیا کمی ہے

....

وہ ہر نعت کے اختتام پر خدائے پاک کا شکر ادا کرتے ہیں۔

شکرِ خدائے پاک ہے پھر نعت ہو گئی
رحمت حبیبِ کبریا کی ساتھ ہو گئی

....

وہ اس بات پر بھی مسلسل اللہ کے شکر گزار رہیں کہ:

شکرِ خدا کہ روز ہی نعتِ نبی ہوئی
قلب و نظر میں مرے بڑی روشنی ہوئی

اور اس سے بھی آگے چلیے، انھوں نے اپنی زندگی اور سانسوں کی چلتی ڈوری کو بھی نعت سرائی کی زنجیر سے باندھ رکھا ہے۔

چل رہی ہیں یہ سانسیں مری نعت سے
نعت ہے اب مری زندگی بے شُبہ

اور ---

دل میں حسرت نہیں کوئی اس کے سوا
نعت کہتا رہوں میں تصوّر سدا

....

تصوّرِ ممدوحِ کائنات کی تمام نعتیں ایک والہانہ پن اور سرشاری کی کیفیت سے معمور ہیں۔ نعتیں پڑھتے چلے جائیں، یوں لگتا ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، نعتوں کے بول اُن پر اترتے چلے جا رہے ہیں۔

اب ہمیں کچھ اور تو کرنے کی فرصت ہی نہیں
ہم ہیں اور یہ نعتیہ اشعار ہیں سرشار ہیں

....

نعت کا موضوع اور مضمون ایسا ہے کہ کہتے چلے جائیں، لکھتے چلے جائیں، ختم ہونے میں نہیں آتا، اور یہ ختم ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ ذکرِ رسول اور مدحت رسول کریم کی رونقیں ہیں جو سدا بہار ہیں۔

گویا اب وہی مضمون ہے؛
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

....

تصوّرِ اقبال کے اس شعر پر آج کی تحریر کا اختتام کرتے ہیں؛

پڑھیں ہر گھڑی سب دُرود و سلام
ہمارے مکاں اور مکیں آپ پر

☆☆☆☆☆

شہناز رضوی کی غزل گوئی

محمد اصغر کاظمی

اردو غزل اپنی تہذیبی، فکری اور جمالیاتی روایت کے اعتبار سے اردو ادب کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ ہر دور میں ایسے شعرا و شاعرات سامنے آتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی بصیرت، خلوصِ احساس اور حسنِ اظہار سے اس روایت کو نئی زندگی عطا کی۔ عصرِ حاضر میں شہناز رضوی بھی انہی معتبر شعری آوازوں میں شامل ہیں جن کی شاعری میں روایت کا احترام بھی ہے اور عصرِ حاضر کے احساسات کی بازگشت بھی۔ ان کی غزل گوئی ایک ایسے ادبی سفر کی نمائندہ ہے جس کی بنیاد مضبوط خاندانی علمی و ادبی روایت، مسلسل ریاضت اور فطری شعری صلاحیت پر استوار ہے۔

شہناز رضوی کا تعلق ایک ایسے علمی و ادبی خاندان سے ہے جہاں ادب کو ہمیشہ عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد برسوں سے اردو زبان و ادب کی تدریس، تحقیق اور ترویج سے وابستہ ہیں۔ یہی علمی ماحول ان کی شخصیت کی تعمیر اور شعری ذوق کی آبیاری کا سبب بنا۔ کم عمری ہی سے انہیں شعر و ادب سے غیر معمولی لگاؤ پیدا ہوا، مطالعے کی عادت نے ان کے فکری افق کو وسعت عطا کی اور مسلسل مشقِ سخن نے ان کے تخلیقی جوہر کو نکھار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی شاعری میں پختگی، متانت اور فکری سنجیدگی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

شہناز رضوی محض ایک غزل گو شاعرہ نہیں بل کہ ایک فعال ادبی شخصیت بھی ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ان کی بھرپور شرکت رہتی ہے، جہاں وہ ترنم اور تحت اللفظ دونوں انداز میں اپنا کلام پیش کرتی ہیں۔ ان کی شیریں آواز، شائستہ لب و لہجہ اور اشعار کی اثر آفرینی

سامعین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھیں مختلف ادبی و ثقافتی تنظیموں کی جانب سے متعدد اعزازات، اسناد اور انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔

ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہو کر اہلِ ذوق سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے، جس میں بنیادی طور پر غزلیات شامل ہیں، تاہم نعتیہ کلام بھی اس کا حصہ ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے، جس میں حمد، نعت، منقبت اور غزل کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ تنوع اس امر کا مظہر ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت کسی ایک صنف تک محدود نہیں بل کہ ان کے اندر مختلف اصنافِ ادب میں اظہار کی بھرپور استعداد موجود ہے۔

شہناز رضوی کی غزلوں کا بنیادی وصف ان کی سادگی، فکری گہرائی اور جذبے کی سچائی ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور غیر ضروری لفظی آرائش سے گریز کرتے ہوئے نہایت سہل اور شگفتہ زبان میں گہرے انسانی تجربات بیان کرتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا شعور، وقت کی بے ثباتی، محبت، خلوص، ایثار، اُمید، اخلاقی اقدار اور انسانی رشتوں کا احترام نمایاں موضوعات ہیں۔ یہی اوصاف ان کی شاعری کو عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم اور اہلِ نظر کے لیے بھی قابلِ غور بنا دیتے ہیں۔

ان کی غزل کا مطلع زندگی کی ناپائیداری اور وقت کی گردش کو نہایت دل نشیں پیرائے میں پیش کرتا ہے:

ہمیشہ دور یہ رہتا نہیں جوانی کا
گزر ہی جائے گا یہ دور خوش گمانی کا

....

یہ شعر انسانی غرور، شباب کی بے ثباتی اور وقت کی اٹل حقیقت کو نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس شعر میں زندگی کی فلسفیانہ معنویت بھی ہے اور نصیحت کا ایک لطیف انداز بھی۔

انسانی تعلقات اور مشرقی تہذیب کی خوشبو ان کے اس شعر میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے:

ہم اپنے آپ کو پھر خوش نصیب سمجھیں گے
ملے جو ہم کو شرف اُن کی میزبانی کا

....

یہ شعر محبت، انکسار، احترامِ انسانیت اور مشرقی تہذیبی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ شاعرہ نے میزبانی کے ایک معمولی سے منظر کو تہذیبی وقار کی علامت بنا دیا ہے۔

قربانی اور ایثار کے جذبے کو وہ اس یقین کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

نہ رائیگاں کبھی جائے تمہاری قربانی
ملے گا تم کو ثمر اپنی جاں فشانی کا

....

یہ شعر امید، عزم، استقلال اور عمل کی قوت کا استعارہ ہے۔ شاعرہ کا یہ مثبت طرزِ فکر ان کی شاعری کو محض جذباتی اظہار نہیں رہنے دیتا بل کہ زندگی کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

وقت کی تیز رفتاری کو انھوں نے نہایت خوب صورتی سے محسوس کیا ہے:

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام و سحر
گزر رہا ہے ہر اک لمحہ زندگانی کا

....

یہ شعر زندگی کے مختصر ہونے اور وقت کی برق رفتاری کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ یہاں شاعرہ نے نہایت سادہ الفاظ میں انسانی زندگی کے ایک گہرے فلسفے کو سمو دیا ہے۔

غزل کے مقطع میں شاعرہ اپنے تخلص کے ساتھ کہتی ہیں:

تمہارے شعر ہیں اردو کی آبرو "شہناز"
ہر ایک بزم میں چرچا ہے خوش بیانی کا

....

یہ شعر شاعرہ کے فنی اعتماد، اردو زبان سے والہانہ محبت اور شعر و ادب سے قلبی وابستگی کا خوب صورت اظہار ہے۔

شہناز رضوی کی غزلوں کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان کے ہاں سادگیِ بیان، سہلِ ممتنع، شگفتگیِ اسلوب، جذبات کی صداقت، فکری پختگی اور تہذیبی شائستگی نمایاں اوصاف ہیں۔ وہ الفاظ کے غیر ضروری تکلف سے بچتے ہوئے کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ ان کے اشعار میں امید کا چراغ ہمیشہ روشن رہتا ہے، اسی لیے ان کی شاعری قاری کو مایوسی کے بجائے حوصلہ، محبت اور مثبت طرزِ فکر کی طرف لے جاتی ہے۔

فنی اعتبار سے ان کی غزلیں کلاسیکی غزل کی بہترین روایات کی امین ہیں۔ ردیف و قافیہ کی صحت، بحر کی پابندی، سلاستِ بیان، موسیقیت، لفظ و معنی کی مناسبت، حسنِ ترتیب، داخلی ربط، محاورے کا برمحل استعمال، تشبیہ و استعارہ کی لطافت، حسنِ تعلیل، تغزل کی چاشنی، رمزیت، ایمائیت اور فطری اندازِ اظہار ان کے کلام کو دلکش بناتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تصنع نہیں بلکہ بے ساختگی ہے، مصنوعی پن نہیں بلکہ احساس کی سچائی ہے۔ یہی عناصر ان کی شاعری کو دل سے نکلنے والی آواز بنا دیتے ہیں۔

شہناز رضوی کی شاعری میں مشرقی تہذیب، اخلاقی اقدار، انسانی وقار اور روحانی لطافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف جذبات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ کردار سازی، امید افزائی اور مثبت فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں محض مشاعروں میں داد وصول نہیں کرتیں بلکہ مطالعے کے بعد بھی اپنے اثرات دیر تک قاری کے ذہن و دل میں باقی رکھتی ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شہناز رضوی کی غزل گوئی عصرِ حاضر کی سنجیدہ، باوقار اور تہذیب آشنا شاعری کا خوب صورت نمونہ ہے۔ ان کا شعری سفر مسلسل ارتقا کی طرف گامزن ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے آئندہ شعری مجموعے بھی اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوں گے۔ ان کی شاعری اس بات کی روشن دلیل ہے کہ جب فطری صلاحیت، خاندانی ادبی روایت، مسلسل ریاضت اور خلوصِ احساس یکجا ہو جائیں تو فن اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، اور یہی اوصاف شہناز رضوی کی غزل گوئی کو عصرِ حاضر میں ایک منفرد اور قابلِ قدر شناخت عطا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

"جنگل مری دیوانگی": فکری ابعاد

بعض شعرا شعر کہتے ہوئے پوری طرح سے اس شعر کے مضمون کے مجموعی تاثر میں ڈوب جاتے ہیں- ایسے تخلیق کار احساسات و محسوسات کے نمائندے کہلاتے ہیں-

اردو شاعری ہر دور میں انسانی احساسات، ثقافتی روایات، سماجی اقدار، فلسفۂ حیات، عشقیہ واردات اور زمانی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی آئی ہے- دورِ حاضر میں جو شاعر قدیم و جدید حسیت اور سادہ اسلوب اپناتے ہوئے نمایاں شناخت قائم کرنے میں کام یاب ہوئے ہیں ان میں سے کچھ مقامی سطح پر تو کوئی ملکی سطح تک پہنچے لیکن معدودے چند شاعر بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے میں بھی کام یاب ہوئے ہیں- ایسا ہی مقامی سطح پر ابھرتا ہوا ایک نام توکل حسین توکل کا ہے- وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ سہی مگر بات کہنے کا ڈھنگ اور بے باکی انھیں ممتاز کرتی ہے- وہ بطور ادبی شخصیت منفرد انداز اور مضبوط آواز کے مالک ہیں- ان کا شعری مجموعہ "جنگل مری دیوانگی" ناسٹیلجیا، سوزِ دروں، ٹوٹتی قدروں، استحصال، یادوں، محبت اور زندگی کے عمیق مشاہدات کا حسین مرقع ہے- انھوں نے اضطہاد اور ایک ایسے نظامِ جبر کو بے نقاب کیا ہے جس میں انسانی شناخت، عزتِ نفس اور آزادی کے ممکنہ امکانات تک سے محروم کیے جانے والے موضوعات اہم ہیں-

عباس علی شاہ ثاقب

توکل حسین توکل 25 دسمبر 1997ء کو صوفی باصفا حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے شہر پاک پتن (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماحول نے ان کی فکری جہات کی نمو میں اہم کردار ادا کیا۔
ابتدائی و مڈل کی تعلیم پاک پتن کے نواحی گاؤں 29 ایس۔پی سے حاصل کی۔ مڈل سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ مگر ادب سے ان کا تعلق آج بھی جاری ہے۔
توکل حسین توکل کے شعری مجموعے
"جنگل مری دیوانگی"
عصر حاضر کی حساس فکر، انسانی زندگی، مشاہدات اور روحانی احساسات کی عمدہ آئینہ دار ہے۔ اس مجموعے میں زندگی کے تلخ تجربات و حقائق، انسان کے داخلی کرب، امید و رجا، محبت، خود شناسی اور تفکر جیسے موضوعات نہایت سنجیدگی اور سادہ مگر مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ شاعر نے متانت اور مشکل فلسفیانہ باتوں کو بھی آسان اور دلنشیں زبان میں بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے قاری اشعار سے فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔
توکل حسین توکل غیر مشروط انداز میں ان منفرد شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے نجی مصروفیات کے باوجود پاک پتن کی شعری روایت میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "جنگل مری دیوانگی" غمِ ہستی، احساسات، عشق، وقت، خود شناسی، کائنات اور روحانی تجربات کا آئینہ دار ہے۔ قاری کو کہیں بھی مصنوعی پن اور بھرتی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز کا نوحہ اور سچے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔
توکل حسین توکل کے پہلے شعری مجموعہ "جنگل مری دیوانگی" میں ایک حمد ایک نعت چار مناقب در صنعتِ توشیح، ایک نظم در صنعتِ توشیح، ایک غزل در صنعتِ توشیح، ایک نظم "وطن کا نوحہ" اور نظم "اے مرے ربِّ کریم" اور اکہتر غزلیات شامل ہیں جسے حسنِ ادب پبلشرز فیصل آباد نے حال (2026ء) ہی میں شائع کیا ہے۔
اس مجموعے میں حمد باری تعالیٰ کے بعد نعت میں شاعر نے حضور اکرمؐ کے خلق کو قرآن قرار دیا ہے۔ نعتِ رسول اور صنفِ نعت کو عمدگی سے زینتِ قرطاس بنایا ہے۔ ان کے ہاں آنحضرتؐ کی بعثت ظلمت سے روشنی، جہالت سے علم و معرفت اور گمراہی سے ہدایت کی طرف رہنمائی کا لازوال پیغام ہے۔
توکل حسین توکل کے مطابق نبی کرمؐ کے مثل کوئی انسان نہیں ہے۔ نعت کا مطلع دیکھیے:

آپ یٰسیں ہیں آپ فرقاں ہیں آپ کا خلق تو عینِ قرآن ہے
آپ کی گفتگو مرحبا مرحبا، آپ کی شان تو شانِ سبحان ہے

....

اس شعری مجموعہ کا نام جس غزل سے لیا گیا ہے وہ غزل حصہ غزلیات میں پہلے نمبر پر رکھی گئی ہے۔ اس غزل کے دو اشعار دیکھیے:

صحرا نما میں آدمی جنگل مری دیوانگی
ہے آفتوں کا، مشکلوں کا حل مری دیوانگی

دیوانے پن میں ہی رہی ہر پل مری دیوانگی
شام و سحر کرتی رہی جل تھل مری دیوانگی

....

بات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنا اور پھر اس میں لفظی نظام کی شائستگی و شستگی اور مضمون کی بھرپور پاس داری توکل حسین توکل کے شعری مجموعہ میں بڑی وقعت کے ساتھ نظر آئی ہے۔ ایک بڑے موضوع کو بڑی ہی فکری پختگی کے ساتھ غزل میں پیش کرنا یقیناً ان کی ادبی بصیرت کی عکس گری ہے۔ زندگی کے گنجھلک موضوعات سے چھیڑ چھاڑ انہیں ہم عصر ادبا میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ شعر دیکھیے:

حیف ہے اس موحد پہ صد حیف ہے
بت شکن ہو کے جو بت کدے میں رہے

....

توکل حسین توکل کے ہاں کچھ اشعار ایسے بھی ملے ہیں جس سے پڑھ کر اچانک چونک جانے کی سے صورت حال پیدا ہو گئی اور پھر اس شعر کو بنظرِ غائر دیکھنے پر دل مائل ہوا۔ یہ موضوع انسانی باطن میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے درمیان برپا ہونے والی روحانی و نفسیاتی کشمکش کا خوش نما استعارہ محسوس ہوتا ہے۔ شاعر نے ''حسین'' کو دنیاوی کشش اور ''خدا'' کو الوہی وابستگی سے تعبیر کر کے آزمائش اور استقامتِ ایمان کی نازکی کیا ہے۔ ''بندگی داؤ پہ ہے لگی'' داخلی اضطراب، اعتراف کمزوری اور روحانی امتحان کی شدت کا مظہر ہے۔ علامتی اظہار، فکری وسعت، نفسیاتی صداقت اور اختصار اس شعر کی نمایاں ادبی خصوصیات ہیں، تاہم پہلے مصرع کی تقابلی ساخت تعبیر کے اعتبار سے مذہبی حساسیت کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ کلاسیکی رنگ کا حامل کلام ان کے شعری در و بست کا عکس گر ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

اک طرف وہ حسیں، اک طرف ہے خدا
اب مری بندگی داؤ پہ ہے لگی

....

عہدِ جدید کا شاعر اب صرف محبوب کا تذکرہ اور اس کی گفت گو ہی نہیں کرتا بل کہ اپنے عہد سے بھی مکالمہ کرتا ہے جو بعض اوقات خود کلامی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

غزل نے اپنی روایت کو چھوڑا نہیں اور ارتقائی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اپنی شناخت کے تشخص مثلاً انسان کی ترجمانی اور جدید شاعری کے کلاسیکی فنی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے نئے تجربات اور نئے شعور کو اپنے دامن کی وسعت میں سموئے ہوئے ہے۔ توکل حسین توکل کے ہاں معاصر اردو غزل کا سب سے نمایاں وصف

یہ ہے کہ اس کا فکری مزاج غیر محسوس انداز سے جدید ہے۔ روایت سے وابستگی اور نئے عہد کے انسان کی آواز کی بنیاد پر انھیں عصر آفریں بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔
شعری مثال ملاحظہ ہو:

بڑی عجیب ہے یہ انقلاب کی صورت
نکالی چوروں نے ہے جو حساب کی صورت

اسی لیے یہ فضا سوگوار ہے شاید
جلا ہے سینہ کسی کا کباب کی صورت

....

غزل کا حساس ترین موضوع اس کا خمیر اور روح ہے
جو المیۂ ہست کی صورت میں داخلی و خارجی کرب کا ترجمان ہے۔ توکل حسین توکل کی بے چین روح جب ایسے سوالات کی اسیر ہو جاتی ہے جن کا اس کائنات میں تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ اپنے کتھارسس کے لیے اشعار کو غزل کی مالا میں پروتے نظر آتے ہیں۔ روح کی پکار کے کانٹے اس قدر چبھتے محسوس ہوتے ہیں کہ "جنگل مری دیوانگی" پکار اٹھتے ہیں۔ اندرونی آوارگی کا استعارہ دھندلکوں اور پُراسرار رموز سے خود کلامی ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

ہم کو نہیں خطرہ کوئی اس زلف کی زنجیر سے
ہم ہیں گرفتار برہ اس دام کی پروا نہیں

....

زندگی ہے مری کوئی دلدل
یار میں ہر قدم میں الجھا ہوں

....

میر تقی میر کے فکری ورثے کو اپنانے والا کلام محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا، بل کہ یہ حیات و کائنات کے تلخ حقائق کا ایک دردناک اور راست مرقع ہوتا ہے۔ رنگِ میریات کا حامل شاعر یا میر تقی میر کو روحانی طور پر مرشد تسلیم کرنے والے کے ہاں جذبۂ عشق محض ایک شعری موضوع نہیں بل کہ ایک زندہ وجودی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی شاعری میں وارداتِ قلب کی سچائی، سوز دروں، احساسِ ہجر، شکستِ آرزو اور زندگی کی ناپائیداری کا شعور اسی داخلی وقار کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے جو میر تقی میر کی روایت کا امتیاز ہے۔ ایسا شاعر تقلیدِ لفظی کا اسیر نہیں ہوتا بل کہ میر کے فکری و جمالیاتی مزاج کو اپنی تخلیقی شخصیت میں جذب کر کے نئے عہد کے تناظر میں اظہار کی تازہ صورتیں پیدا کرتا ہے۔ یہی فکری اور موضوعاتی ہم آہنگی اسے رنگِ میریات کا حقیقی حامل بناتی ہے۔ توکل حسین توکل کے ہاں میر تقی میر سے فکری مطابقت اور موانست پائی جاتی ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

بیانِ اشکِ غم ہے سلسلہ در سلسلہ ان میں
ترے شعروں میں لگتا ہے کہ رنگِ میر باقی ہے

وہ سخن کا حق ادا کر ہی نہیں سکتا کبھی
جو ابھی تک میر سے استاد سے بیزار ہے

....

زندگی جمود سے بغاوت اور ارتقا کی جانب مسلسل سفر کا نام ہے۔ توکل حسین توکل کے ہاں فکری بیداری اور عملی بھاگ دوڑ ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی میں تحریک اور تحرک لازم ہے۔ جمود مرگِ مسلسل اور تحرک آفاقی زندگی کا ساز وسامان ہے۔ تغیر آشنا روح اور فعالیت پسند انسانی جذبہ ہی ان کا مطمعِ نظر ہے۔ یہی مسلمان کا حقیقی تعارف ہے کہ وہ بھی جمود کا انکاری ہے اور کشفِ ذات کے لیے تگ و دو کا داعی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں جانتا ہوں آشیاں اپنا جلانے کا ہنر
شامل مری فطرت میں ہے بجلی گرانے کا ہنر

....

توکل تیغ سازی کا ہنر سیکھ لے مجھ سے
ترے ذمہ ابھی تو وادیٔ کشمیر باقی ہے

....

توکل کی غزل میں نوجوانوں جذبوں اور عشقیہ مضامین کی پیش کش کا رنگ غالب تو نہیں ہے تاہم ان کے ہاں واردات قلبی کو بڑے دیدہ زیب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جذبات کی حدت میں کسک مگر اظہار میں تجربات کی ترشی میں بڑا سوز ہے۔ جمالیاتی حس اور وارفتگی کی باطنی تربیت نئی جہت اختیار کر گئی ہے۔ ان کے ہاں عشق خارجی مظاہر سے آگے بڑھ کر انسانی وجود، احساس اور شعور کی تہوں میں اترتا ہے، جس کے باعث جذباتیت کبھی سطحی یا جذبات انگیز نہیں بنتی بلکہ فکری ضبط اور جمالیاتی توازن کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی توازن ان کی غزل کو محض عشقیہ اظہار سے بلند کر کے ایک باوقار داخلی مکالمہ بنا دیتا ہے، جہاں احساس، فکر اور فن ایک دوسرے سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔
اس میں جذبے کی تہذیب، فکری ضبط، داخلی مکالمہ، جمالیاتی توازن اور واردات قلبی کی فنی تشکیل جلوہ ریز ہے۔

ہو گئے تم پر فدا اس بات میں کچھ شک نہیں
ہو گئے ہم تو فنا اس بات میں کچھ شک نہیں

....

دل تجھے سونپ دوں پر مجھے یہ پتا
دل دکھانا ترا مشغلہ تو نہیں

....

کس زیرک انداز میں سماجی بحران کو قرطاس پر منتقل کرتے ہیں کہ نفرت اور انسانی المیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ توکل حسین توکل بہانگ دہل منفی رویوں کے مقابلے میں محبت، امن اور روحانیت کے پیامبر بن کر ابھرے ہیں۔ یہی فکری اثاثہ ان کے ماتھے کا جھومر بن کر نمایاں ہو گیا ہے۔ شعری سفر کم مگر مشاہدے کی پختگی اور اظہار کی فعالیت خوش آئند ہے۔ ''جی بھر گیا مرا'' کا بلیغ استعمال کرتے ہوئے یہ مصرعہ

اس کی کیفیتِ زار کو انتہائی پختگی سے ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کی کشمکش اور بہار کی نام نہاد خوش نما رعنائیوں سے اب طبیعت مکمل طور پر بیزار ہو چکی ہے۔ شعر دیکھیے:

ہر شاخِ نخلِ جان کی ٹھہری خزاں طلب
اب موسمِ بہار سے جی بھر گیا مرا

....

ہے غمِ روزگار بھی الجھن
میں کسی اور غم میں الجھا ہوں

....

وجودیت کا تصور مقدم جانتے ہیں اور زندگی کو محض زندگی ہی نہیں مانتے بل کہ اس زندگی پر سوال اٹھا کر اعمال کو کردار کی کسوٹی پر پرکھنے کا معیار متعین کرتے ہیں۔ انسان کا اپنے فیصلوں اور کاموں کے ذریعے اپنی پہچان خود بنانا اور حقیقی مقصد کا تعین کرنا ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں 'انسان' کا وجودی کرب صرف ذاتی ہی نہیں بلکہ عالمی انسانی بحران کا بھی عکاس ہے۔

عصرِ حاضر کا انسان اخلاقی اقدار کی پاس داری سے گریزاں اور اپنی ذات کے حصار میں قید ہو چکا ہے۔ آج کا انسان روحانی بے معنویت کے طاغوت کے نرغے میں ہے۔ بڑی معنوی وسعت کی حامل سوچ توکل حسین توکل کے ہاں اس ضمن میں پائی گئی ہے۔ شعر دیکھیے:

تو نائبِ کریم ہے آدم کا ہے سپوت
کیسے مٹے گا دنیا سے باطل ترے بغیر

یہ بات ہے حقیقت کڑوی تجھے لگے گی
جو روگ کو مٹا دے ایسی دوا نہیں تو

....

توکل حسین توکل کے ہاں عشق کے داخلی کرب کی ٹیسیں تڑپا دینے والی ہیں۔

قاری شعر خوانی کے دوران اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اس قدر درد آگیں فضا قائم ہو جاتی ہے کہ محبوب کی یاد مسلسل قاری کے ساتھ رہتی ہے۔ توکل حسین توکل کی لگائی گئی گرہیں ضبط کا استعارہ اور خود کو سنبھالنے کی علامت کے طور سامنے آئی ہیں۔

سوز دروں کا ساز بڑا دل گداز ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

مری آہ و فغاں بھی توڑ کر دم بیٹھ جائے گی
صدا آخر صدا ہے اک صدا زندہ رہے کب تک

مرا دل جل رہا ہے بجھ رہا ہے یاد میں اس کی
مرے دل میں یہ یادوں کی ہوا زندہ رہے کب تک

....

آج کا انسان اقدار کے انہدام اور مادیت پرستی کے بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ وسائل کی کم یابی، اجتماعی بے حسی اور فکری بکھراوٹ کا حامل معاشرہ شکست وریخت کا شکار ہو کر حقیقی المیے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

افراط و تفریط، طبقاتی استحصال اور ادارہ جاتی ناانصافیاں عام انسان کے لیے ایسا اژدہا بن چکی ہیں کہ

انسان اپنے ہی معاشرے میں اجنبیت، بے یقینی اور عدمِ تحفظ کے احساس میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔
اجتماعیت مفقود اور انفرادی و ذاتی مفادات مقدم ہیں۔
فرد کی انفرادیت سماجی جکڑ بندیوں اور مصلحتوں کے بوجھ تلے دبتی جا رہی ہے۔
نتیجتاً اخلاص و خدمت کی جگہ مفاد پرستی نے لے لی ہے۔
اس صورتِ حال کی حقیقی پیش کش اور تعمیری اصلاح توکل حسین توکل نے عمدگی سے کی ہے۔ شعری مثال ملاحظہ ہو:

ظالم کہو، جاہل کہو یا جو کہو تم اب ہمیں
ہم کو ذرا بھی اب کسی الزام کی پروا نہیں

....

ہر کوئی ہی رو رہا ہے خون کے آنسو یہاں
ہر کوئی ہے بے نوا اس بات میں کچھ شک نہیں

....

توکل حسین توکل کے اشعار محبوب کی بے اعتنائی و بے وفائی اور شاعر کی بے بسی کی تصویر ہے۔ اپنے منتشر جذبات کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی اندرونی اضطراب برقرار رہتا ہے۔
آپ محض جذباتی شاعر نہیں بل کہ ایک حساس اور باصلاحیت ادیب ہیں۔ فکری گہرائی اور سادہ مگر اثر انگیز اسلوب ان کی شاعری کو معاصر اردو ادب میں الگ پہچان عطا کرتی محسوس ہوتی ہے۔
غرض و غایت اور مقصدی ابعاد کی مجموعی چھاپ خوش نما حیرت عطا کرتی ہے۔
جنگل مری دیوانگی استعاراتی تفاعل کی صورت فکری پیراہنِ رنگیں سے مزین ہے۔
شاعر کے ہاں جذبے اور فکر کا تفاعل بھی نمایاں ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

دبایا ہے گلا اس نے وفا کا آج پھر ایسے
وفا کی لاش پر آنسو بہا کر جا رہا ہوں میں

....

گزر جائے کہیں نہ ہجر میں یونہی سفر سارا
کسی کا وصل کا وعدہ وفا ہوتا تو اچھا تھا

....

توکل حسین توکل کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں بلکہ فکری سطح پر شعور اور تجربے کی عطا و اختراع ہے۔ ان کے اشعار میں فنی پختگی فکری وسعت اور سادہ اسلوب ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، جو انہیں معاصر اردو شاعری میں ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔
ان کی شاعری جدید انسان کا نوحہ اور زندگی کے تجربات کے المیہ کی عکاسی کرتی ہے۔
ان کا شعری مجموعہ "جنگل مری دیوانگی" عصرِ حاضر میں پاک وطن کے ادبی منظر نامے کی اہم ادبی تخلیقات میں قابلِ قدر اضافہ شمار کیا جا سکتا ہے۔
توکل حسین توکل حساس تخلیق کار اور صاحبِ فکر شاعر ہیں۔ ان کا مخاطب انسان اور زمانی آشوب ہے۔ ان کا کلام محض لطف ہی نہیں دیتا بل کہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا

ہے۔ انھیں سمجھنے کے لیے بین المتون مطالعہ ضروری ہے۔ انھیں تعلیمی قابلیت کے پیمانے پر پرکھنے کے بجائے تخلیقی صلاحیتوں پر پرکھنے کی ضرورت ہے۔ انھیں ایک صاحبِ علم مذہبی صاحبِ فکر و صاحبِ کشف انسان کے طور پر دیکھا جائے تو قاری کو راحت آگیں خوشی ہوگی۔

شاید توکل حسین توکل کی شخصیت میں سادگی، واردات قلبی کی گہرائی و گیرائی وجد آفریں معلوم ہوتی ہے۔

وہ ایک ایسے شاعر ہیں موزونیت جن کی طبع میں دیکھنے میں آئی ہے۔ ان کے قلم میں لفظی کی سحرکاری نہیں ہے بل کہ سادہ زبان و بیان کا ایک چشمہ سا پھوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو کسی آبشار کے جھرنے کی مانند ایک شیریں زمزمہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ قادر الکلام نہ سہی مگر بات دل سے کہتے ہیں جو دل کو لگتی ہے۔ تاہم انھیں الفاظ کے لیے سرگرداں نہیں ہونا پڑتا۔ دل آویز انداز میں دل دوز موضوعات کی پیش کش ان کی متاع ہے۔

ان کی شخصیت کا عکس ان کے فن کا روپ دھار کر پرتو خیال کا آئینہ دار بن چکا ہے۔ ان کے کلام میں جمالیاتی احساسات پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔

ان کی درویشانہ طبع اور بے باکی سے بات کہنے کا ڈھب انسانی وقار کا عکاس ہوتا ہے۔ دراصل شاعر کی دیوانگی کو محض پاگل پن قرار نہیں دیا جا سکتا بل کہ شدت احساس کا نوحہ ہے۔

اس کے ہاں کرب کے آثار انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی شعور سے ارتباط و انسلاک رکھتے ہیں۔ اس کی شاعری داخلی واردات کو فکری سطح پر منتقل کرتی ہے۔ یوں وہ اپنے عہد سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ''جنگل'' اس بے ترتیب اور بے رحم دنیا کا استعارہ ہے جس میں ایک حساس روح اپنی شناخت، اپنے وقار اور اپنے احساس کو بچانے کی جدوجہد کر رہی ہے بل کہ اندر اور باہر کی بے ترتیبی کا مشترک استعارہ ہے۔

''جنگل'' دراصل اس کی شعری کائنات کی علامت ہے۔

''ہر گلِ را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق فکری و فنی مدارج طے کرنے کی استعداد کار الگ الگ ہے۔ زبان و بیان کے تناظرات کے ابعاد خوش نما ہیں۔ کارزارِ شعر میں لاکھوں قلم کار قلم و قرطاس کی نذر ہوئے، ذوق و شوق کے پروردہ ٹھہرے مگر رد و قبول کی سند ان کی مقبولیت کا تعین کرے گی۔ الفاظ کی تال اور موضوع کا میل یا یوں کہیے محسناتِ کلام صنائی نظام کے زیرِ اثر فروغ پا رہا ہے۔ اُمیدِ واثق ہے کہ جس طرح توکل حسین توکل نے اس میدان میں قدم رکھا ہے وہ یقیناً خوش آیند ہے اور ہمیں مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

☆☆☆☆☆

منفرد فکری جہت رکھنے والا باوقار شاعر __ عاطف جاوید عاطف

اردو میں نظم سے مراد وہ سخن ہے جس میں کسی ایک مرکزی خیال موضوع یا فلسفے کو مربوط اور مسلسل انداز میں بیان کیا جاتا ہے غزل کے برعکس اس کے ہر شعر کا مفہوم ایک دوسرے سے جڑا ہوتا ہے اور اس کا ایک ہی عنوان ہوتا ہے اردو نظم کی باقاعدہ شروعات دکن کے دور سے ہوئی جبکہ جدید نظم کا آغاز مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی سے ہوا۔ حضرت اقبال نے اردو نظم کو فلسفہ خودی اور اسلامی احیائے فکر کے ساتھ عروج بخشا۔ جوش ملیح آبادی نے نظم کو روانی اور شاندار الفاظ سے ثروت مند کیا۔ برصغیر میں نظم لکھنے والے اکثر شعرا نے انگریزی اور فرانسیسی ادب سے متاثر ہو کر نظم معراء اور آزاد نظم کو متعارف کروایا اور عروج پر پہنچایا جن میں ن م راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، مجید امجد، اختر الایمان، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، احمد فراز، پروین شاکر، جون ایلیا، کشور ناہید اور امجد اسلام امجد جیسے نام اردو ادب کے افق پر روشن ہیں۔

اسی قبیل کے نوجوانوں کے علمبردار شاعر عاطف جاوید عاطف کی کتاب دعا ہے تم پر

طلحہ غفور

بھی نظم اترے ایسے دور میں منظرِ عام پر آئی ہے جب غزل کی آڑ میں ہر طرف قافیہ اور ردیف پیمائی ہو رہی ہے ایسے دورِ ناہنجار میں کسی شاعر کی نظم کے حوالے سے ایسی بے مثال خوب صورت اور شائستہ نظموں کا گلدستہ یقیناً اردو ادب پر میں یہ سمجھا ہوں کہ شاعر کے نزدیک نظم روایتی نظم کا نام نہیں بل کہ ایسا وسیع تجربہ ہے جو افراد وقت معاشرہ اور کائنات پر ممکنہ تبدیلیوں کو دیکھتا سمجھتا محسوس کرتا اور پھر خوب صورت پیرائے میں اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے نظموں کا کرافٹ بتاتا ہے کہ مشاہدہ ان کے ہاں ایک فکری وجودی اور کائناتی کیفیت بن کر سامنے آتا ہے جس کے نتیجے میں پڑھنے اور سننے والے کی قلبی کیفیات کو ایک شاعر کی نظر سے کائناتی رموز کو دیکھیں اور سمجھنے کی دعوت و ترغیب ملتی ہے۔ ایک نظم سماعت فرمایئے:

بابا مجھ کو ڈر لگتا ہے

بابا میری مس کہتی ہیں
کل سے سب بچوں کو اپنے
گھر رہنا ہے گھر پڑھنا ہے
میں نے سنا ہے
ایک بڑے سے کالی مونچھوں والے انکل
بم لگا کر آئیں گے
سب بچے مر جائیں گے
بابا کیوں ماریں گے ہم کو؟
ہم سے کوئی بھول ہوئی کیا؟
ہم سے کیوں ناراض ہیں انکل
بابا ان کو گڑیا دے دوں؟
یا پھر میرے رنگوں والی
یاد ہے نہ وہ نیلی ڈبیا
میری پچھلی سالگرہ پر
مجھ کو آپ نے لا کر دی تھی
اور میری وہ پیاری پونی
ریڈ کلر کی تتلی والی
وہ بھی دے دوں؟
پھر تو نہ ماریں گے مجھ کو؟
یاد ہے بابا ایک دفعہ جب
میرے ہاتھ پہ چوٹ لگی تھی
بہت زیادہ درد ہوا تھا
تھوڑا خون بھی نکلا تھا
بہت زیادہ روئی تھی میں
کیا یہ بم بڑا ہوتا ہے
بہت زیادہ چوٹ لگے گی؟
درد زیادہ ہوگا شاید
بابا مجھ کو ڈر لگتا ہے

……………

اسی طرح اگلی نظم "جب ریل کی پٹڑی رستے میں بازار سے پہلے پڑ جائے" ہمارے معاشرتی غم کی مسلسل اور ہمہ گیر نوعیت کو سامنے لاتی ہے یہاں غم صرف ایک لمحہ یا کیفیت نہیں بل کہ مکمل شعور ہے بستی کے ننھے پھولوں کی آنکھوں میں بسے خوابوں کا شعور ان کی مسکراہٹ کا شعور ان کی خواہشات کا شعور ان کی بھوک و مفلسی کا ادراک یا پھر ماں باپ کو تا عمر ناقابلِ برداشت غم میں مبتلا کرنے کا ادراک یہاں شاعری کا دوام ہے ان نظموں میں شاعر ایک ننھے بچے کی آنکھ سے دہشت گردی کو دیکھتا سوال اٹھاتا اور سوچنے کی ترغیب دیتا ہے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی دہشت گردی، غربت، بیماری اور مظلوم کو انصاف کی عدم دستیابی ہمارے ایسے معاشرتی مسائل ہیں جن سے ہزاروں لاکھوں لوگ حادثاتی طور پر لقمہ اجل بن چکے ہیں تاہم ظالمین کی طرح شاید منصفین کے دلوں پر بھی مہر ثبت ہو چکی ہے۔

انسانی زندگی میں کچھ چیزوں کے لیے انسان کو کم یا زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے پھر ان کا ملنا نہ ملنا جلد یا دیر سے ملنا قسمت پر منحصر ہوتا ہے کچھ چیزیں انسان کو عطا ہوتی ہیں اور ہر عطا ایک نعمت ہے عاطف جاوید عاطف پر نظم کی دیوی مہربان دکھائی دیتی ہے اس لیے میں ان کی نظم کے بارے شروع میں لکھی گئی جسم میں زہر گھولنے والی بات سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ "زہر کسی صورت عطا میں شمار نہیں ہوتا۔"

آزاد اور حالی کی طرح عاطف جاوید عاطف کی نظمیں روایتی خواب و خیال کی دنیا اور بے مقصد رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی مقصدیت اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

اردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں جناب عاطف جاوید عاطف کو خوب صورتی سے جدید معاشرتی مسائل کے بارے محبت و ایثار سے لبریز اور سائنسی دنیا کا احاطہ کرتی تا دیر زندہ رہنے والی نظموں کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر ان کے رزقِ سخن میں برکت اور وسعت عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

اور بڑھی تاریکی

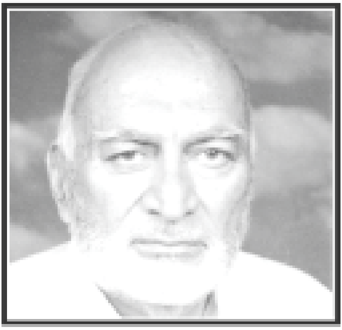

جمعہ 24 جولائی۔ آصف ثاقب صاحب بھی چلے گئے۔

اناواناالیہ رجعون۔

مجھے بالکل بھی یاد نہیں کہ ثاقب صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ 1984یا1985 کا زمانہ تھا۔ میں نے ایبٹ آباد پوسٹ گریجویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ثاقب صاحب بائی ڈیپارٹمنٹ کے لیب انچارج تھے۔ جب کہ میں میتھس کا سوڈنٹ تھا۔ سردی کے موسم میں اکثر وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باہر ایک کرسی ڈال کے دھوپ سینکنے کے لیے بیٹھے ہوتے۔ میں اور وحید قریشی وہاں سے گزرتے ہوئے نہ صرف انھیں سلام کرتے بل کہ ان کے پاس بیٹھ کے مزے مزے کی باتیں بھی سنتے۔ ہماری کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ جب وہ کسی بات پر زیادہ خوش ہوتے تو بلند و بالا قہقہہ لگاتے۔ جملہ چست کرنے سے بھی قطعاً باز نہیں آتے تھے۔

انھی دنوں صوفی عبدالرشید صاحب بھی اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ صوفی صاحب نے اپنی تمام تر زندگی ترقی پسند نظریات کے فروغ کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گزاری۔ ان کے سارے کلام کا مجموعی تاثر اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ لہجہ رومانوی اور اسلوب کلاسیکل اپنایا۔ کم لکھا اور بھرپور لکھا۔ وہ غزل کو خالص اس کے رنگ، خوشبو اور ذائقہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس بات کو لے کر ثاقب صاحب نے ایک دن مجھے اور وحید قریشی کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے مزے سے کہا۔

''صوفی صاحب خالص غزل کی اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کوئی خالص گھی کی بات کر رہا ہو۔''

سعید اشعر

اس کے بعد وہ اپنا مخصوص بلند و بالا قہقہہ لگانا نہیں بھولتے تھے۔ جیسے یک دم کسی نے زور سے چٹکی بجادی ہو۔

اپنی جگہ وحید قریشی نے بڑی کوشش کی کہ ویسی آواز میں قہقہہ لگا سکے لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔

ثاقب صاحب کی ایک اور عادت بھی ہم دونوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ جب بھی کسی مشاعرے میں انھیں کسی شاعر کا کوئی شعر بہت پسند آتا تو وہ اپنے سر کو ایک مخصوص انداز سے ہلاتے۔ جیسے ایک لمحہ کے لیے حالتِ وجد میں چلے گئے ہوں۔ میری اور وحید قریشی کی مسلسل ان پر نظر ہوتی کہ دیکھتے ہیں کب کوئی شعر انھیں پسند آتا ہے۔

ثاقب صاحب دیکھنے میں جتنی سخت طبیعت کے نظر آتے تھے وہ بالکل اس کے برعکس خوش طبع، خوش وضع اور ہنس مکھ تھے۔ نئے لکھنے والے ہوں یا پرانے، دونوں کے ساتھ یکساں احترام اور اپنائیت کا سلوک رکھتے۔ ان کے اس رویے سے نئے لکھنے والوں کے اندر ہمت اور اعتماد پیدا ہوتا۔

میں نے دیکھا جس قد کی وہ شخصیت تھے ان کی بول چال اور چال ڈھال میں رائی بھر اس کی جھلک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ سلطان آف بوئی کے فرزند ہونے کے باوجود ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔

ان دنوں وہ کالج کے میگزین ''کاغان'' کے ہندکو سیکشن کے انچارج بھی تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ہندکو نہ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ سکنے کی مجھ میں صلاحیت ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اصرار کر کے مجھ سے ہندکو میں دو نظمیں لکھوائیں۔ نظمیں پڑھ کے بے پناہ خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

''مجھے معلوم ہے آپ ہندکو میں بہت اچھی شاعری کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی آپ اس طرف دھیان نہیں دے رہے۔''

ان میں سے ایک نظم انھوں نے ''کاغان'' کے ہندکو سیکشن میں شامل کی۔

ان کی بات درست ثابت ہوئی۔ پچھلے سال میری چار ہندکو کی کتابیں چھپیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آسمانِ اردو ادب پر ''فنون'' سب سے زیادہ روشن ستارہ تھا۔ ثاقب صاحب کی باقاعدگی کے ساتھ اس میں غزلیں چھپتی تھیں۔ ان کا اس دور کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

فلک پہ تار نفس کی لکیر چھوڑ گیا
جہاز کوئی دھوئیں کی لکیر چھوڑ گیا

....

میرے نزدیک ثاقب صاحب کی شاعری کا بنیادی مزاج جدید حسیت اور کلاسیکی شعری روایت کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی لیے اس پر ہمیشہ ایک جدید کلاسیکی رنگ حاوی محسوس ہوتا ہے۔

یہاں ''دھوئیں کی لکیر'' ایک جدید منظر (ہوائی جہاز) سے لی گئی ہے۔ مگر

"تارِ نفس" جیسی کلاسیکی، فارسی آمیز اور رمزیت سے بھرپور ترکیب اسے محض منظر نگاری نہیں رہنے دیتی بل کہ ایک استعاراتی کیفیت عطا کرتی ہے۔
جدید شے (جہاز) اور کلاسیکی اسلوبِ بیان کا یہی امتزاج اس شعر کو جدید کلاسیکی رنگ دیتا ہے۔
فنون کا کوئی ایک شمارہ بھی شاید ایسا گزرا ہو جس کے "اختلاف" والے حصے میں ثاقب صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہو۔ عروض سے متعلق جتنی بحثیں ہوتیں وہ عام طور پر ثاقب صاحب کے اٹھائے گئے سوالات یا دیے ہوئے نکات کے گرد گھومتیں۔ علمِ عروض پر ان کا کہا ایک سند تھا۔
ہندکو ادب کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو وہ صرف ایک قادر الکلام شاعر نہیں۔ بل کہ ان کا شمار ہندکو زبان کے جدید ادب کی بنیاد رکھنے والوں میں ہے۔ انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہندکو ادب کو بھی مسلسل اپنی ترجیحات میں رکھا۔ بل کہ میں تو کہوں گا ان کا شمار ہندکو ادب کے معماروں میں رہے گا۔
جدی پشتی ایک ریاست کے سلطان ہونے کے باوجود ان کے اندر ایک عادت بھی ایسی نہیں تھی جس سے ان کے قریب موجود آدمی کو اندازہ ہوتا کہ ان کا تعلق کسی رائل فیملی سے ہے۔ مزاجاً فقیر تھے۔ ایک بار ان کے والد ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں داخل تھے۔ ہم کچھ دوست انھیں دیکھنے کے لیے گئے۔ ان کے لیے ایک مخصوص کمرہ تھا۔ اگرچہ یہ ان کی ریاست کا ہاسپٹل نہیں تھا لیکن کمرے کے آس پاس سناٹا اور خوف کی فضا تھی۔ اگرچہ ان کی ریاست پاکستان میں ضم ہو چکی تھی۔ لیکن مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔
ثاقب صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک دن میں، ڈاکٹر سفیان صفی اور نسیم عباسی ان سے ملنے کے لیے بوئی جا پہنچے۔ یہ ایک سرسبز و شاداب پہاڑوں کے بیچ وادی تھی۔ ایک راہگیر سے ثاقب صاحب کا پوچھا تو اس نے ایک پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کر دیا۔
"وہ پہاڑی کی چوٹی پر جو حویلی ہے وہ ان کی ہے۔"
گاڑی کو ایک محفوظ جگہ پارک کر کے ہم تینوں پہاڑی کی چوٹی کی طرف لپکنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ہانپتے کانپتے جب ہم حویلی کے قریب پہنچے تو کچھ دیر کے لیے اکھڑی ہوئی سانسوں کو متوازن کرنے ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔
ابھی ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کہیں سے چار پانچ خونخوار قسم کے کتے آ کے ہمارے گرد چکر لگانے لگے۔
خوف سے ہماری بری حالت ہونے لگی۔ اتنے میں وہاں کچھ جوان لڑکے بھی آن موجود ہوئے۔ ان میں سے ایک ثاقب صاحب کا فرزند بھی تھا۔ ہماری جان میں جان

آئی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا یہ کسی نواب یا سلطان کا ہی بیٹا ہو سکتا ہے۔ مجھے بار بار اب یہ خیال آ رہا ہے کہ اگر ہم ثاقب صاحب کے مہمان نہ ہوتے تو وہ کتے ہمیں ادھیڑ کھاتے۔

کسی نے ثاقب صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع کی۔ وہ ہمیں حویلی کے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ ان کے پرکھوں کی حویلی تھی۔ پوری حویلی قیمتی لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ دیواریں، چھت اور شاید فرش بھی۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ گھر میں موجود روایتی فرنیچر بھی قیمتی لکڑی کا تھا۔ پتہ چلتا تھا کہ یہ رہائش کوئی عام رہائش نہیں۔ اس کے باوجود ثاقب صاحب کی فقیری اپنی جگہ برقرار تھی۔ انھوں نے کسی اور کو زحمت دینے کے بجائے خود ممکنہ حد تک ہماری خدمت کی اور ہمارے ساتھ وہی دوستانہ اور بے تکلفانہ رویہ رکھا۔ ہم پورا ایک دن اور ایک رات وہاں رہے۔ اس بلندی پر حویلی ایسے مقام پر تعمیر کی گئی جہاں سے نیچے پوری ریاست اور حویلی کی طرف آنے والے ہر راستے پر نظر رکھی جا سکے۔

کچھ روز پہلے کی بات ہے احمد حسین مجاہد کی ایک پوسٹ سے پتہ چلا کہ ثاقب صاحب شدید بیمار ہیں اور اس وقت ایوب میڈیکل کمپلیکس کے ایک عام وارڈ میں کسمپرسی کی حالت میں داخل ہیں۔ ان کے احتجاج کرنے پر انتظامیہ اور متعلقہ لوگوں کو شاید کچھ شرم آئی۔ اسی وجہ سے انھیں فوری طور پر آئی سی یو میں منتقل کیا گیا۔

اتفاق سے میں پاکستان میں موجود تھا۔ ایک دن ان کو دیکھنے وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کے انھوں نے ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ میں نے یک دم ان کا ہاتھ تھام کے مصافحہ کیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں انھیں کیا کہوں۔ کیا بات کروں۔ بس ویسے ہی دو تین بار کہا۔

”اللہ خیر کرے گا۔ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے“

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نظر اُٹھا کے ان کا چہرہ تک نہیں دیکھ سکا۔ مجھ سے دیکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔

میرے ساتھ میرا ایک دوست منہاج تھا۔ واپسی پر میں نے اس سے ثاقب صاحب کے بارے میں پوچھا۔

”تمھیں کیا لگتا ہے؟“

اس نے بھی مایوسی کا اظہار کیا۔

ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

آخر میں ثاقب صاحب کے دو ہندکو شعر پیش ہیں۔

چاک تے تخت پہلڑاں پیسی
آخر اتھوں جلڑاں پیسی
اتھرو بنڑ کے اکھیاں اندروں
سنگیاں جوگے ڈھلڑاں پیسی

☆☆☆☆☆

الوداع ـــــ آصف ثاقب

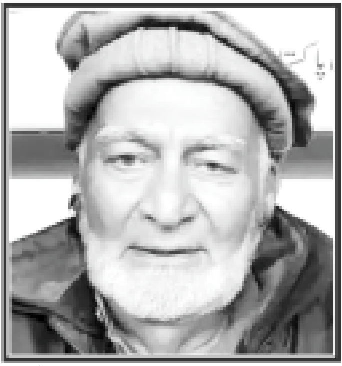

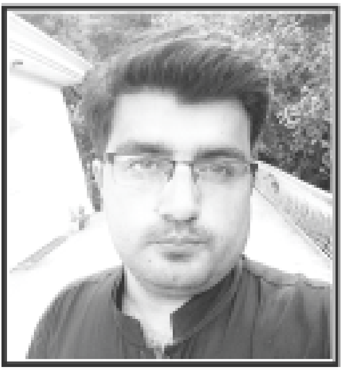

آصف ثاقب بھی اپنی زندگی کی اننگ مکمل کر کے عدم کے پویلین کو لوٹ گئے۔ انھوں نے ایک طویل اور بھرپور زندگی گزارنے کے بعد دنیا کو الوداع کہا۔ آصف ثاقب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اعلیٰ پائے کے شاعر، عمدہ ادیب، علم عروض کے ماہر، بائنی کے استاد نہایت بزلہ سنج، انسان دوست اور محفل کو کشتِ زعفران بنانے کا ہنر جانتے تھے ۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہیں۔

میری پہچان یہی ہے ثاقب
مجھ کو دیکھو تو خدا یاد آئے

....

میری ان سے چند ہی ملاقاتیں رہیں، جو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ میں کیڈٹ کالج میں زیر تعلیم تھا تو وہ وہاں ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ سٹیج پر کلام سنانے آئے تو سماں باندھ دیا۔ کالج کے پرنسپل بریگیڈیئر (ر) سید ساجد حسین شاہ نے ان کے کلام کی بہت تعریف اور انھیں کالج کی اعزازی شیلڈ بھی دی۔

2010 میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ عطر شیشہ میں ایک ہوٹل پر کچھ دیر کے لیے رُکے۔ میں اپنے ابو کے ہمراہ انھیں ملنے گیا۔ ان کی دس برس کی پوتی نے اپنے دادا جان کے لاتعداد شعر سنائے اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو حیران کر دیا۔ آصف ثاقب نے مجھے بھی اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی۔ ان کا میرے والد گرامی ڈاکٹر ہارون الرشید کے ساتھ برسوں خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔

باسم ہارون

آج سے دو سال قبل ان کی علالت کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا۔ وہ اپنے خطوط میں اکثر میرے مستقبل کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور دعائیں دیا کرتے تھے اور مجھ سے اچھی توقعات رکھتے تھے وہ میرے لیے قابل فخر شخصیت تھے۔ آج سے دو سال قبل گرمیوں کے دنوں میں ان کی عیادت کے لیے میرے والد گرامی، رفیع شاعر عقا سعید الرحمٰن اور شہباز سرور بوئی گئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان کی رہائش گاہ سے ذرا اوپر ایک کالج ہے یہاں ہم بیٹھ کر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ نوے سالہ آصف ثاقب خود چل کر ہمارے پاس آئے اور بڑی گرم جوشی سے ملے۔ والد گرامی نے انھیں چند کتابیں اور ادبی رسائل پیش کیے۔ آصف ثاقب نے رفیع شاکر عقا جو افسانہ نگار ہیں اور سعید الرحمٰن جو شاعر ہیں کے ساتھ گپ شپ کے دوران ان کی تیزی سے سپید ہوتی ہوئی داڑھی پر کچھ پر مزاح لطائف سنانے اور شہباز سرور جو نوجوان شاعر ہیں ان سے ان کی غزل سنی اور کلام کے بارے میں قابل تحسین کلمات کہے۔

کوئی دو گھنٹے ان کے ساتھ نشست رہی۔

کیا پتا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

ہماری بہت خواہش تھی کہ پھر ان کو دیکھنے ان کے گاؤں بوئی جائیں، لیکن بدقسمتی سے پھر کوئی ایسا دن نہ آ سکا۔ میری دادی جان امسال اپریل میں دنیا سے رخصت ہوئیں تو ان کے بیٹے نے تعزیتی فون کیا اور بتایا کہ آصف ثاقب ایوب میڈیکل کمپلیکس ایبٹ آباد میں زیر علاج ہیں۔ انھوں نے ان کے قریبی دوستوں اور احباب کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا۔

دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا، خدا جانے آصف ثاقب کس حال میں ہوں گے۔

24 جولائی کو ان کی وفات کی خبر سوشل میڈیا پر پھیل گئی۔

ایک جم غفیر ان کے جنازے میں شرکت کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ بوئی کے ڈگری کالج میں ان کی نماز جنازہ سے قبل ان کی اہل بیت سے عقیدت اور محبت کو تازہ کیا گیا۔ پھر ایک نعت خواں نے ان کی نعتیہ کلام پیش کی۔ نماز جنازہ کے بعد ان کی میّت کو ایک جلوس میں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا۔ جہاں انھیں ہزاروں سوگواروں اور ان کے چاہنے والوں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی۔ والد محترم اور میں اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی۔ والد محترم اور میں اس وقت سخت دکھی تھے۔ آصف ثاقب کا ایک خوب صورت شعر بار بار زباں پہ آ رہا تھا۔

مری تدفین تم آ کر تو دیکھو
پرندہ مجھ پہ مٹی ڈالتا ہے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹرز بلائے جان

تمنا ہے گلابوں سے میں اُلجھوں
چنبیلی کے بھی سائے چاہتا ہوں
ڈاکٹروں کی دو چار باتیں
پھر اُس کے بعد چائے چاہتا ہوں

عرضِ مکرر کے طور پر میں آپ کو مسلسل شامتوں کی اقسام بتاتا چلوں، کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ جب چیونٹی کی شامت آتی ہے تو اسے پر لگ جاتے ہیں۔ جب مکھی کی شامت آتی ہے تو وہ مکڑے کے جال میں پھنس جاتی ہے اور جب ہم جیسے بیماریوں کے مارے مریضوں کی شامت آتی ہے تو ہم ڈاکٹر حضرات کی طرف چل پڑتے ہیں۔

بھئی ہمارے ہاں ڈاکٹرز کیا ہیں.....؟ نیم حکیم خطرہ جان کے قول پر پورا اُترنے والے جن کی کرم نوازیوں سے دن میں بھی تارے نظر آتے ہیں۔ بلا کسی تشخیص کے ان کو محض دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مریض میرے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے کیوں کہ ڈاکٹر تو کچھ کرنے سے رہا...... بعض اوقات تو ان ڈاکٹرز کی معصومیت اور بھولے پن کی بدولت آپریشن کے دوران قینچی، تولیے، ٹشو پیپرز اور آلاتِ جراحی بھی مریض کے پیٹ میں ہی رہ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ تو ہمارے ساتھ بھی عجیب و غریب اور نہ سمجھ آنے والی صورت حال پیش آئی جب کسی "ہما" نام کی خاتون کا ٹیسٹ رزلٹ غلطی سے ہمیں تھما دیا گیا تو ٹیسٹ دیکھ کر یقین جانیے پیروں تلے زمین کھسک گئی اور اپنے آپ کو خاتون محسوس کرتے ہوئے میرے بدن میں محسوسات و احساسات کی برقی رو اس تیزی سے دوڑنے لگی کہ گدگداہٹ اور آزاد خیالات ذہن میں آتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا "ہائے میری جان"۔ مگر جلد ہی میں اپنے ہوش و حواس

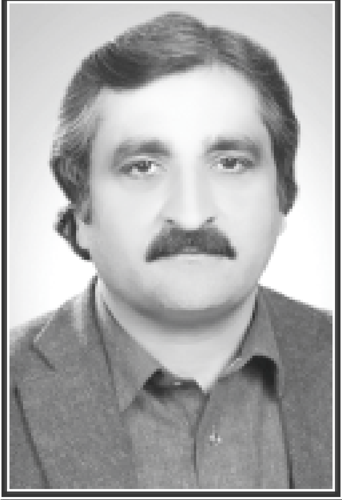

ہمایوں خان

میں واپس آیا اور دم تحریر اُسی رزلٹ کے بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی تو لکھنے بیٹھ گیا۔

یہ دُنیا مختلف قسم کے ڈاکٹروں کے بھری پڑی ہے جبکہ ڈاکٹروں کی مختلف اقسام منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ممکن ہے کہ ساس، بیوی کی اقسام کم ہوں، محبوباؤں اور رقیبوں میں بھی اتنی ورائٹی نہ پائی جاتی ہو مگر ہر ڈاکٹر دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ جیسے سالے، سالیوں اور ہم زلفوں مختلف شکل و صورت وضع قطع اور جنونی صلاحیتوں کے ساتھ مختلف رویئے لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر کسی حال میں خوش نہیں رہتا مگر ہاں اس حال میں ضرور خوش رہتا ہے جب مریض زیادہ ہوں۔ بعض ڈاکٹر صاحبان اپنے گھر کو بھی چلتا پھرتا ہسپتال بنا لیتے ہیں۔ بیوی بیچاری شوہر (ڈاکٹر) کی ذہنی وجسمانی حالت دیکھ کر اپنی بیوگی کے ملبوسات بھی ایک خاص شاہانہ ترتیب سے قبل از وقت تیار رکھتی ہے اور اپنے سرتاج (ڈاکٹر) کو وصیت نامہ بھی تیار رکھنے کا مشورہ دیتی ہے۔

ان ڈاکٹر حضرات میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی شاہانہ زندگی کے بل بوتے پر حاکمانہ شان برقرار رکھتے ہیں۔ بعض ایسے نکے اور ماہر نفسیات بھی ہیں کہ اپنی ساکھ کی کمی کو اچھے اخلاق سے پوری کرتے ہیں۔ اور ایسے تو بہت زیادہ ہیں جن کی نہ تو ساکھ اچھی اور نہ اخلاق اچھے، مگر مریضوں پر رُعب و دبدبا اس طرح جماتے ہیں کہ اُن کو گھنٹوں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹروں کی فیسیں، انداز بیاں اور معائنے کا طریقہ واردات بھی ایک دوسرے الگ ہوتا ہے۔ بھلا مریض خود کو "دیوارِ مہربانی" پر ہی کیوں نہ لٹکا دیں علاج مفت نہیں ہوتا۔ اگر مریض امیر زادہ، خان زادہ، نواب زادہ ہو تو ڈاکٹر صاحب دودھ، مکھن، دہی، پنیر کا مسکا لگاتے ہوئے بغل گیر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مریض غریب ہو اور اپنی حالتِ زار بھی بیان کرے تو ڈاکٹر کی طبقاتی جس جاگ اُٹھتی ہے اور مختلف ٹیسٹ لکھ کر مریض کو خطرے کا سگنل دیتے ہوئے اتنی دوائیاں لکھ دیتے ہیں کہ مریض کی دوائی پورے محلے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ مریضانِ دل کی شریانیں تو ڈاکٹروں کی فیسیں سُن کر اور بھی سکڑ جاتی ہیں ہاں البتہ فیسوں اور بیماریوں کی بھی قسمیں ہیں۔ دل گردے، جگر کی بیماری ضدی اور ڈھیٹ قسم کی ہوتی ہے اس کے برعکس پیٹ درد، قبض کی بیماری لاحق ہو تو ڈاکٹر کی فیس سنتے ہی رفع ہو جاتی ہے۔ اور تو اور بسا اوقات تو ڈاکٹر اپنے مریض سے یوں بھی مخاطب ہوتے ہیں:

اِک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یوں
کرتا ہے اپنا راستہ دُشوار کس لیے

پیسے نہ تھے علاج کے، گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہُوا ہے تُو بیمار کس لیے

.....

جب سے لوگوں نے ہنسی مذاق کرنا، پیدل چلنا، کم کھانا، قہقہے لگانا، پیٹ بھر کے ہنسنا اور کم سونا بند کر دیا ہے اور جلنا بلکنا، سسکنا، گھوٹنا، آہیں بھرنا زیادہ کر دیا ہے تو اعصاب اور معدے کے امراض کے ساتھ ساتھ دل گردے، شوگر، بلڈ پریشر جیسے امراض میں ایسے اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسے مہینے کی پہلی تاریخ پر بیگم کی فرمائشوں کا ہوتا ہے۔ آج کل ایسے ڈاکٹروں کی بھی کمی نہیں جو مریضوں کو چکر دینے کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ داروں اور جاننے والوں کو بھی چکمہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ معائنہ کے دوران بات کو گھما پھرا کر اور گاجروں میں گٹھلیاں ملا کر ایسا انداز بیان پیش کرتے ہیں کہ سب چکرا جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی ہستیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں جو خلقِ خدا کو باقاعدہ اُکساتی اور بھڑکاتی ہیں کہ انہیں بُرا بھلا کہا جائے۔ اِس اُکسانے اور بھڑکانے میں ہمارے ڈاکٹر صاحبان بھی شامل ہیں۔ ہم خود بھی اس قسم کے حالات سے گزرے ہیں تبھی جا کے معلوم ہوا کہ بُرا بھلا کہنے کی وجوہات کیوں کر وجود میں آتی ہیں۔ اور جب لوگ بھی زخموں پر بار بار نمک چھڑک کے پوچھیں کہ اجی! کیسا رہا یہ نیا ڈاکٹر! تو یہ شعر گنگناتا ہوں

افواہ تھی کہ میری طبیعت خراب ہے
لوگوں نے پوچھ پوچھ کے بیمار کر دیا

....

بعض ڈاکٹر صاحبان کو ہم نے بنفسِ نفیس دیکھا ہے کہ کلینک میں سگریٹ پیتے ہوئے اپنا رتبہ بڑھانے کا رعب جماتے ہیں کیوں کہ ہمارے ہاں بہت سے ماہرین نفسیات کا دعویٰ ہے کہ سگریٹ پینا ڈاکٹروں کے لیے ضروری ہے اس میں کوئی بُرائی نہیں وجہ یہ ہے کہ جس طرح کے خیالات، احساسات اور جذبات ڈاکٹر صاحبان مریض کے حق میں رکھتے ہیں سگریٹ کے دھوئیں سے بآسانی باہر آ جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ دانتوں میں ٹوتھ پک چھپاتے اور دباتے ہوئے اتنی گہری سوچ و بچار کے ساتھ دوائی لکھتے ہیں جیسے بیک وقت تشخیص کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ بھی صادر فرمادیں۔ بعض تو معائنہ کرنے سے پہلے نسوار منہ میں رکھتے ہوئے ایک آنکھ ایسی دبا کر بند کرتے ہیں جیسے ایک ہی آنکھ سے مریض کا الٹراساؤنڈ کر رہے ہوں اور تو اور آج کے ماڈرن دور میں کلینک میں ٹی وی، کیبل تک چلاتے ہیں۔ اور ٹی وی دیکھتے دیکھتے مریض کا معائنہ بھی کرتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹرز اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ موبائل پر بات کرتے کرتے بھی مریض کا معائنہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست گاؤں میں ڈاکٹر ہیں۔ ان کا انداز بیان اور معائنہ واردات نرالے رنگ ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ مریض کا معائنہ کرتے کرتے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں انسان کو اللہ نے جو صلاحیت عطا فرمائی ہے بیک وقت

استعمال کرنے سے حقِ بندگی ادا ہو جاتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ صاحب تو راہ گزرتے لوگوں سے مریض کے معائنہ کے دوران دُعا سلام اور سبزی فروش سے خریداری بھی کر جاتے ہیں۔

بھئی! ان میں بعض ڈاکٹر صاحبان بڑے نیک اور متقی بھی ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تسبیح تو دوسرے ہاتھ سے چیک اَپ کرتے ہیں اور بعض تو (وقفہ برائے نماز) کی تختی دروازے پر آویزاں کر کے نیک نام بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اب تو بات مزید بڑھ گئی ہے کہ بعض ڈاکٹر مریضوں کو نفسیاتی گرویدہ بنانے کے لیے کسی سکرین پر مذہبی ویڈیو پروگراموں کے ویڈیوز تک چلا دیتے ہیں۔ آج کے دور جدید کے ڈاکٹر صاحبان روشن خیال اور آزاد خیال ہیں۔ کسی شاعر نے اس کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

ستارے توڑ سکتا ہے یہ دریا موڑ سکتا ہے
کبھی قوسِ قزح کے ساتھ یہ ناتا جوڑ سکتا ہے

حضرت! غصہ نہ کریے ہے ہمارے دور کا ڈاکٹر
کُھلی اس کو اجازت ہے یہ لبی چھوڑ سکتا ہے

....

ڈاکٹر اور مریض دُنیا کے وہ اہم کردار ہیں کہ جن سے دُنیا کی رونقیں، خوشیاں، دلچسپیاں، سرگرمیاں، اُداسیاں، دوائیاں اور جمائیاں تک جنم لیتی ہیں۔ ڈاکٹر اور بیوی کی خاموشی کوئی اچھی علامت نہیں ہوتی بل کہ ضرور کسی طوفان کی پیشگوئی کرتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ڈینٹل ڈاکٹر وہ واحد ہستی ہے کہ سیاستدان، داماد، ساس سسر اور سالیوں تک سے منہ کھلوانے کا ہنر اور حکم جاری کر سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے اتنے مریض ہوتے ہیں کہ اُن کو یہاں تک یاد نہیں رہتا کہ کون عزیز ہے اور کون مریض۔ ایسے ہی ایک ڈاکٹر کے پاس ایک خاتون آئیں۔ ڈاکٹر نے شناسا چہرہ دیکھ کر یاد کرتے ہوئے کہا

"محترمہ! آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے"۔

محترمہ فرمانے لگی "آپ نے مجھے پہلی دفعہ اُس دن دیکھا تھا جس دن ہماری شادی ہوئی تھی"۔

اسی انداز کے ایک معائنے سے ہم خود بھی اس وقت گزرے جب ہمیں عرق النسا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شفقت اور محبت دکھائی اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"میاں! میں تہہ دل سے دُعا گو ہوں کہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں"

میں خوش ہوتے ہوئے بولا "جناب! آپ کی نیک تمنا، آرزو، خواہش اور دُعا ہمیشہ میرے ساتھ رہے"

ڈاکٹر بُرا سا منہ بناتے ہوئے دوائی لکھ کر مجھے جلدی سے رُخصتی کا پروانہ تھما دیا، وہ تو بعد میں کسی دوست سے معلوم ہوا کہ تمنا، آرزو، خواہش اور دُعا اُن کے بیگمات کے نام تھے۔

☆☆☆☆☆

یادوں کے پنکھ......دل داجانی اور جوتے کا کنکر

بے شمار نوری سالوں پہلے میں نے اپنے سامنے یہ گیت بنتے دیکھا، وزیر افضل-- نور جہاں-- حزیں قادری اور نیلو وہیں تھے-- ان پر ایک ماورائی کیفیت طاری تھی، وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے نہ تھے، دلوں میں کوئی چور چھپائے پھرتے تھے--

آج پھر جوتے میں کنکر ڈالنا پڑا گلی کے ایک مکان کی کھڑکی سے پھر ریڈیو پر ایک گیت بج رہا ہے-- یہ تین منٹ کا گیت راہ رو کے کئی یگوں پر محیط ہو گیا ہے-- کنکر کے بہانے اس عرصے میں وہ کبھی جوتا اتارتا ہے اور کبھی پاؤں میں ڈالتا ہے--

ابھی تو مکھڑا بجا ہے اور دل محوِ رقص ہے-- یہ بھیرویں ہے، ایک ٹی وی چینل پر فریحہ پرویز نے وزیر افضل کی موجودگی میں بتایا تھا-- مکھڑے پر ہی گانے نے جیسے ٹرانس میں لے لیا ہو--

دل داجانی
سیونی میرے دل داجانی
وکھونی مکھ موڑ گیا جے
تکوونی دل توڑ گیا جے
سیونی میرے دل داجانی

....

وزیر افضل کا یہ جادو سب پر چلا، گلی کے فقیر سے لے کر اشرافیہ کے قوال اسے گائے بغیر نہ رو سکے-- مجھے لگا میں نے یہ دُھن لاکھوں سال پہلے بھی سنی تھی- یہ کمپوزیشن ہمیں آنے والی صدیوں تک تنگ کرے گی-- یہ گیت باقاعدہ بکری کے بچے کی طرح چراگاہ تک پیچھا کرتا ہے-- اصل میں یہ وہ گیت ہے جس کی چراگاہ دل ہے چرتے ریوڑ جہاں اس پر ناچتے نشے میں ہیں-- گھٹنے سبزے کن اکھیوں سے سپید مرکی لے پر جھومتے موسیقار کی قبر ٹھنڈی کرتے ہیں--- پہلا استانزا سنتے ہیں--

او چاندا اے کریا کول جیہڑا ہیندا اسی
رونے دے کے چلیا ہسدا جیہڑا رہندا اسی
ہائے نی ھن مُکر گیا جے
لا کے نیوں توڑ گیا جے
سیونی میرے دل داجانی

....

تنویر قاضی

عجب مقامات ہیں عجب منزلیں ہیں گلی میں کتنی دیر رُکیں ایک بھاگتی ہوئی گلی میں رُکنا آسان نہیں۔ کنکر کا حیلہ کب تک چلے گا اب تو پیر زخمی ہوتے ہیں۔ اکیلا بندہ واہ گا نا سن کر بند کمرے میں ناچنے لگ جاتا ہے۔۔ ہنستے لوگ روتے ہیں روتے مانس گھاؤ گھاؤ سینوں پر یادوں کے پھاہے رکھتے ہیں۔۔ یہ بھیرویں میں گایا گانا وزیر افضل، نور جہاں، نیلو اور حزیں قادری کا تبرک ہے جو سب کے ہاتھوں بٹتا رہے گا۔۔

کبھی کسی نے کسی کو ہاڑا ڈالتے نہیں دیکھا تو، دل دا جانی، میں نیلو کو دیکھ لیں جو کالے لباس میں گوری بانہیں اونچی کر کے ہاڑا ڈالتے کھیت پار کرتی ہیرو کے پیچھے آتی ہے۔۔ وہ جدائی کا منظر ناظرین کو بھی گلیڈ و گلیڈو کرتا ہے۔ سینما ہال میں ہم نے پتھر دلوں کو بھی آنکھوں کے آگے بازو کر کے روتے دیکھا جب کہ ناک بھی بہتی ہو اور کہنیوں کو رومال کرنا ہو۔ دوسرا ستانزا دیکھتے ہیں۔۔ نیلو ایک ماتمی فضا بناتی گیت کے خیمے میں کھو جاتی ہے والہانہ انداز میں۔

مُڑ کے وی نئیں تکدا، تکدا جیہڑا راہ ہنداسی
نال مراں گا تیرے، روز جیہڑا کہندا سی
ہائے نی ھن مکر گیا جے
لا کے نیوں توڑ گیا جے
سیونی میرے دل دا جانی

اندازہ لگائیں وہ دھوکے باز ہے پر ڈاھڈا سوہنا بھی ہے۔۔ اس سے دغا فریب کھانے میں مزہ کچھ اور ہی ہے۔۔ کوئی ہتواں لطف اس کی جانب کشاں کشاں لیے جاتا ہے سوا دھوکا کھانے کو۔۔ سوہنا ڈاھڈا ہوتا ہے اور ڈاھڈے کا ستی وِیہہ سو ہوتا ہے۔۔ تماشا تو لگ گیا، جس میں یہ راہگیر پھنسا ہوا اپنے کنکر لگے پیروں سے تُبکا تُبکا گرتا لہو دیکھتا دھمال میں ہے۔۔ گلی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔۔

تماشا لگ گیا ناں۔ تیسرے ستانزے کی منت کرتے ہیں اس تماشے کو اختتام دینے کو اگر مانے تو۔۔

پہلاں جاندی تینوں، کدی میں نیوں لاندی ناں
سوہنیا دھوکے بازا، دھوکا تیرا کھاندی ناں
ہائے نی ہن مکر گیا جے
لا کے نیوں توڑ گیا جے
سیونی میرے دل دا جانی

پتہ نہیں یہ میوزک ڈائریکٹر لوگوں کے ساتھ کیا اور کھیل کھیلے گا کہ وہ جب جب یہ دھن اور حزیں قادری کے بول سنتے ہیں کسی بڑی بارش کو پکارتے ہیں کہ انہیں رونا بہت آتا ہے دوسرے لوگوں سے چھپتے پھرتے ہیں کالے بادلوں سے اور برسنے کی التجا کے ساتھ۔ جن کی آنکھ اور ناک ایک ساتھ بہتے ہیں۔۔ راہگیر کا سفر جاری ہے۔ ایک مکان کی ناراض کھڑکی ہوکے کی آواز کے ساتھ بند ہو جاتی ہے۔۔ گلی معمول کی ڈگر پر چلنے لگتی ہے۔۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ایک دقیانوسی نظم

خالد احمد

سورج پر اجیالی کس کے رات وداع ہوئی
صبح نے باگیں تھام کے دن کا چابک لہرایا
پل میں کھال ادھیڑ کے پل پل پرزے کر ڈالا
سرپٹ ٹاپیں کرنیں بن کر گھر گھر گونج اٹھیں
بھان سمان بھبھوکے لپکے، بھانڈے ٹکرائے
گھر کا گھر کھانے کو دوڑا، کھسیانے کھسکے

o

سورج کا رتھ ٹوکری بن کر دن بھر سر پر رہا
اجرت کا اجل اجیالا شام ڈھلے پھیلا
ایک اچاٹ اداسی دل میں دیپ اجال گئی
معبدِ گل سے بلند ہوئی کن خوشبوؤں کی اذان
رنگ پرے باندھے صف در صف سجدہ ریز ہوئے
اندھیاروں کی ڈولی اتری، رات طلوع ہوئی
آنکھ کا نور اندھیرے بن کر دیے تلے پھیلا
کولھو کے بیلوں سے گھر کوسوں ہی دور رہا
پروا کیا پروان چڑھائے پھولوں کا پروار
کھل کھل ہنسنے والے پل میں رونے لگتے ہیں

ارشد کے لیے ایک نظم

وہ اِک ستارہ
جو میرے دل کے اُفق پہ اُس وقت جگمگایا
کہ میں ابھی نوجوان تھا
اور ہمارے گھر میں مسرّتوں کی وہ لہر دوڑی
جو بے کراں تھی
اگر وہ ہنستا تو سب کے دل میں مہکتی
کلیاں چٹکنے لگتیں
ہم اُس ستارے کی روشنی پر نگہ جماتے
تو اپنی آنکھوں میں نُور پاتے
یہ تب ہوا جب کہ میں ابھی نوجوان تھا

پھر اُس کی تابانیاں بڑھیں
اُس نے ماہِ کامل کا رُوپ دھارا
اُفق اُفق اُس کی روشنی کا نکھار پہنچا
بہت ستاروں نے جھک کے اُس کو سلامیاں دیں
تو میری بوڑھی نظر نے اُس کی بہار دیکھی

مجھے خبر تھی کہ اُس کے دل میں مرے
لیے کس قدر فراواں محبتیں ہیں

مرے تصوّر میں تھا کہ جب میں غروب ہوں گا
تو وہ کہیں، اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپے
الگ کھڑا اشکبار ہوگا
مگر یہ کیا ہے
جہاں میں آنا تو ایک ترتیب سے ہے لیکن
یہاں سے جانے میں کوئی ترتیب ہی نہیں ہے
کہ وسطِ افلاک میں درخشاں وہ ماہِ کامل
پلک جھپکنے میں لڑکھڑایا
اور آسماں کی بلندیوں سے
شہابِ ثاقب کی طرح روشن لکیر بن کر
زمیں کے سینے میں جا سمایا

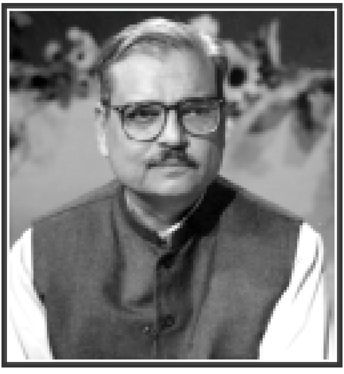

خورشید رضوی

نظم

وقت سارا حساب رکھتا ہے
دلِ ڈیورانٹ سے
بصیرت لے
کھول تاریخ کے
سبھی صفحے
یہ کہانی
مثالیت کی نہیں
ہے کتھا
نسبت و تناسب کی
آہنگ
معیارِ خیر و خوبی پر
ہر تمدن کی
گہری جانچ کے بعد
اپنے عکسِ جلی پہ
ڈال نظر
کس قدر منفرد ہے
یکتا ہے
کوئی
ایک اک زاویہ
پرکھتا ہے
وقت
سارا حساب
رکھتا ہے

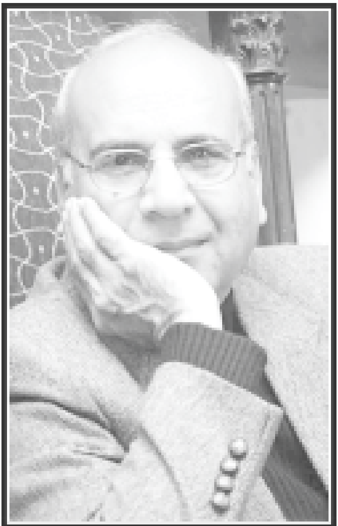

جلیل عالی

گڑیا (نثری نظم)

گڑیا جیسی بچی تھی وہ
ننھے منے ہاتھ تھے اس کے
جب وہ اپنی موٹی موٹی، گہری گہری
آنکھیں موند کے کھولتی،
کھول کے موندتی
کتنی اچھی لگتی تھی!
جھوٹ موٹ وہ سو جاتی تھی
اوں اوں کر کے رو دیتی تھی،
پھر یکدم ہنس دیتی تھی
کتنی پیاری لگتی تھی!
یکدم جب وہ ہنستی تھی،
پھول کی صورت کھلتی تھی

☆

آخر اک دن یک دم اس نے
جب اپنی آنکھیں یوں موندیں
اور اپنے ننھے منے ہاتھ اور پاؤں اک لمحے میں
ڈھیلے چھوڑ دیے
پہلے تو ہم اس کو بھی اس کا اک کھیل ہی سمجھے
لیکن اس نے آنکھیں موند کے پھر نہیں کھولیں
جھوٹ موٹ کا کھیل نہیں تھا،
وہ تو اصلی نیند میں ڈوب گئی تھی،
گہری، پکی نیند
مجھ کو بھلا وہ اس حالت میں
کیسے اچھی لگ سکتی تھی؟

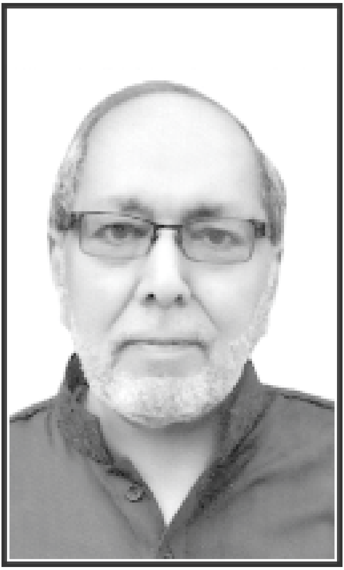

نسیم سحر

ہماری جیت پکّی ہے

بہت ہی بے یقینی ہے ، بہت یونہی گزاری ہے
کہ اک مدت سے ہم نے زندگی یونہی گزاری ہے

مگر اب بے قراری کا یہ پتھر دل پہ بھاری ہے
کہ ہر سُو اب صدائے صُورِ اسرافیل جاری ہے

قیامت کا سا لمحہ ہے کہ محشر سی صدائیں ہیں
بلائیں ہی بلائیں ہیں ، بلائیں ہی بلائیں ہیں

ہے اب رزمِ بلا کا معرکہ آباد ہونے کو
یہ تاج و تختِ ظلم و جَور ہے برباد ہونے کو

فسادِ خلق سے ڈرتے تھے لیکن اب نہیں ڈرتے
ہم اس جینے پہ مرتے تھے، مگر اب ہم نہیں مرتے

تہی داماں ہیں ، بے مایہ ہیں ہم کیا ہار جائیں گے
ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں جو ہار جائیں گے

غرور و بانکپن ، جَور و ستم تم ہار جاؤ گے
بہت کچھ ہے تمھارے پاس جو تم ہار جاؤ گے

تمھاری ہار پکّی ہے ، ہماری جیت پکّی ہے
یہ صدیوں سے چلی آئی ہے جگ کی رِیت پکّی ہے

اوریا مقبول جان

اِک زمانہ تھا

اِک زمانہ تھا
کہ تاروں سے بھرا رہتا تھا فلک
پیڑ میں پھول کو سوغات دیا کرتی تھی
چاند جھک جھک کے ملا کرتا تھا گلزاروں سے
اور سورج بھی سلامی کو اُتر آتا تھا
تتلیاں اڑتی ہوئی آتی تھیں گلستانوں میں
ننھے بچے انھیں دیکھ کے کھل اُٹھتے تو
رنگ ہر سو ہی فضاؤں میں بکھر جاتے تھے
جھولے پڑے تھے_ ہر اک گاؤں میں برساتوں میں
سایۂ زُلف جو پڑتا تھا رُخِ روشن پر
کتنے گل رنگ سویروں کو ضیا ملتی تھی
کیسے پیان ہوا کرتے تھے گھنی چھاؤں میں
اِک زمانہ تھا
اِک زمانہ تھا کہ حاصل تھا ہمیں دل کا سکوں
بات سنتے تھے تحمل سے، ادب کرتے تھے
اپنے پیاروں سے فقط پیار طلب کرتے تھے
لوگ اپنوں سے جو اِک بار بچھڑ جاتے تھے
کتنے اخلاص سے پھر ربط بہم رکھتے تھے
کوئی ناراض جو ہوتا تھا منا لیتے تھے
پیار کے نام پہ ہر زخم سہا کرتے تھے

اِک زمانہ تھا
اِک زمانہ تھا کہ اخلاص و وفا کے پیکر
وقت پڑنے پہ تعلق کا بھرم رکھتے تھے
کام آتے، وفا کرتے، حیا کرتے تھے
اِک زمانہ تھا
مگر اب وہ زمانہ ہے کہاں

نثار ترابی

نظم

ہمارے سامنے حد نظر تک ریت پھیلی ہے
سرابوں کا سمندر ہے
سراسیمہ نگاہوں سے
جدھر بھی دور سے دیکھیں
ادھر پانی ہی پانی ہے
اگر نزدیک جائیں تو سراسر آنکھ کا دھوکا
ہمارے پاس جینے کو
لہو کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ باقی
عجب بیم و رجا کی کیفیت نے گھیر رکھا ہے
کہاں وہ چاہِ یوسف ہے
کہ جس کی جستجو میں ہم نے اتنی خاک چھانی ہے
ہمیں اس ریت پر اب اور اتنی دیر چلنا ہے
کہ جب تک مر نہیں جاتے
زمیں میں گڑ نہیں جاتے
ہمارے پاؤں یہ ٹانگوں سے بالکل جھڑ نہیں جاتے
ہمارے ہر طرف وحشت
وہی خوئے بیابانی
لق و دق پیاس کے صحرا میں کوئی ابر کا ٹکڑا
دکھائی کیوں نہیں دیتا
ہماری چشم نم سے ریت کے ذروں نے لگتا ہے
مزہ پانی کا اس دنیا میں پہلی بار چکھا ہے
ہمیں کیوں ایسا لگتا ہے
جہاں پر خاک اڑتی ہے
وہاں بادل نہیں آتے
ہمارے پاؤں سے لے کر فلک تک خاک اڑتی ہے
یہاں بادل نہیں آتے
مرے مالک
تمہاری ریت پر تو ایڑیاں ہم نے بھی رگڑی ہیں
رگڑ کر ایڑیاں ہم نے بھی، اپنی جان دے دی ہے
پیمبر تو نہیں تھے ہم جنہیں زندہ اٹھاتا تو
ہماری گریہ زاری سے
ہماری آہ و زاری سے
کوئی چشمہ نہیں پھوٹا
یہ چشمہ پھوٹتا کیسے
ہمارے قبضہ قدرت میں کوئی معجزہ کب ہے

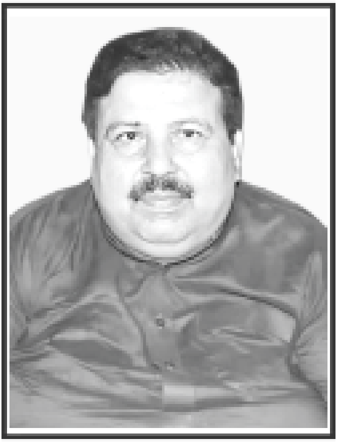

مسعود احمد

دور پہاڑوں سے اُترتی اُداس نظم

دُور برف پوش پہاڑوں کے اُس پار
شام اپنے زخم لیے آہستہ آہستہ وادیوں
میں اُترتی ہے
ہوائیں درختوں کے کندھوں پر سر رکھے
جب میری اُداس نظم سناتی ہیں
تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت نے
کسی شکستہ دل کی آخری صدا کو فضاؤں
میں قید کر دیا ہو
اُفق کے کنارے سورج اپنے خواب سمیٹے
پہاڑوں کے عقب میں دفن ہو جاتا ہے
آسمان پر پھیلی سرخی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے
جیسے کسی عاشق کے سینے سے ٹپکتا ہوا
آخری قطرۂ خوں
کائنات
کی پیشانی پر ثبت ہو گیا ہو
ہم ملے تو خزاں رسیدہ راستوں کے
مسافروں کی طرح
اور فاصلے ایسے بڑھے کہ لفظ باقی رہے
مگر صدا کہیں کھو گئی
تقدیر ہماری کہانی کے پہلے صفحے پر ہی
اپنا فیصلہ لکھ کر قلم توڑ چکی تھی
مگر پھر بھی دل ایک ضدی چراغ کی
مانند مسلسل جلتا رہا
اور کوئی آواز وقت گزر جانے کے بعد بھی
روح کی ویران وادیوں میں گونجتی رہی
میں آج ہی شام ڈھلے اُنھی پہاڑوں سے لوٹا ہوں
دُور پہاڑوں سے ایک خاموش اُداسی ڈھلتی ہے
جو نظم کی صورت زمین پر اُترتی ہے
جس کا ہر مصرعہ دُکھ کی چادر اوڑھے ہے
جس کی صورت ماتمی جلوسوں جیسی ہے
جس کا ایک ایک لفظ سسکتا محسوس ہوتا ہے

طلعت شبیر

نظم ___ اداسی خاموشی میں گنگناتی ہے

رات نے آہستہ آہستہ
سیاہی میرے کمرے میں بچھا دی
اک جیتا جاگتا احساس
میرے دل کے دروازے پر آ بیٹھا
کیا اندھیرا صرف روشنی کی غیر موجودگی
ہے؟

ہوا نے کواڑوں میں
کوئی پرانی دھن چھیڑی
یادوں کا اک ساز
اپنی ٹوٹی ہوئی تاروں کے ساتھ
اب بھی بجنے پر بضد ہے۔

چاند نے ادھوری سی شکل دکھائی
بادلوں کے پیچھے سے
ادھورا ہونا بھی کبھی کبھی
پورا ہونے سے زیادہ سچا لگتا ہے۔

وقت بوڑھے قدموں سے
کمرے میں ٹہلتا ہے
میں نے پوچھا:
"کیا ہر گزرا لمحہ
خود کو خود دفناتا ہے؟"
وقت مسکرایا، بولا:
"میں تو زندہ رہتا ہوں۔۔
ہر سوچ کے ساتھ، ہر یاد کے ساتھ۔"
دفن تو تم خود کو کرتے ہو،

رات نے اپنا ہاتھ آہستگی سے
میرے ہاتھ پہ رکھا اور کہا
مجھے پڑھو نہیں، سنو
اداسی لفظوں میں نہیں
خاموشی میں گنگناتی ہے۔

سرفراز تبسم

قیدی بارش

بارش بھی
قیدی ہوتی ہے
موسم کی

صوفی بارش
یکساں برسنا چاہتی ہے
تنگ کرتا ہے دھونس جماتا سمندر
کیکڑا کیکڑا
زخمی کرتا سپنوں کو ساحل پر
پرزن وین میں

بارش ڈال کر
لے جاتے ان کو دیکھا ہے لوگوں نے
پیاس بندھی تھی
گم شدگان کی
گاڑی کے پہیوں سے

دور مخالف سمت میں جاتے
آنکھ فرات بھی دیکھتا تھا
دل کی چھت پر تنہا طائر اوپری بولی بولتا تھا

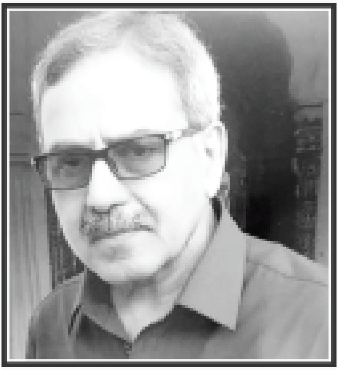

تنویر قاضی

دھوتی ہے بارش اپنے پاؤں

بارش کس کر پیچھے بال بناتی ہے
ماتھا اور کشادہ کرتی

جل
کی
پہنائی میں
دلدل سوا لبادہ کرتی

ناک
کی

سونے کی چوری کی نتھلی
گرد، برادہ کرتی

چاندی کی پائل چھنکاتی
عمر کا رستہ سادہ کرتی

دھوتی ہے بارش اپنے پاؤں
جھرنے پر
کالے ہرن جگالی کرتے سوچ رہے ہیں
فربہ فربہ درد جگاتی ہمسائیگی جنگل کی

نقالی

لبِ گُل پر ذرا سی مسکراہٹ اک مشقت ہے
کدھر جاؤں؟
کہ مجھ سے میری دنیا مسکراہٹ مانگتی ہے
میں خوش رہتی ہوں
تاکہ مجھ کو میرے دیکھنے والے
مرے اطراف بسنے والے ہر دم دیکھ کر خوش ہوں
مجھے تو دُکھ منانے کی سہولت ہی نہیں ہے
کھِلے رہنا مرے معمول کا حصہ ہے
مجھ پر فرض ہے رکھنا تبسم نوکِ لب پر
میں مرجھائی تو یہ گلشن مرا ابھی سوکھ جائے گا
سو آئینے کے آگے اپنے ہی ہنسنے کی نقالی کیے جاتی ہوں روز و شب
دُکھوں کے گھونسلے بننے نہیں دیتی
پرندوں سے شجر خالی کیے جاتی ہوں روز و شب!
مجھے ڈر ہے کہیں احساس سے
جنسِ تبسم ختم ہو جائے،
تو پھر میں کیا کروں گی!

رخشندہ نوید

قبریں، کتبے اور خودرو گھاس (نثری نظم)

خواب بستر پر
نیند سڑک پر
زندگی جھیلیں
اور بچپن کہیں کھیلوں میں
گم ہو جاتے ہیں
لفظ اپنا لباس ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اپنے آپ کو
غزلوں، نظموں، افسانوں میں
تلاش کرتے پھر رہے ہیں
بے چہرہ اور بے شناخت
زندگی کرنا کتنا مشکل ہے
مرکزوں سے بچھڑے دائرے
پرکاروں میں ٹوٹے ہوئے زاویوں کی
کوئی پہچان نہیں ہوتی
جس طرح بن باپ کے بچے کا نام
زمانہ رکھتا ہے
وقت زمانہ بھی ہے
دشمن اور دوست بھی
اس کے دیے ہوئے زخم
ناسور بن جاتے ہیں
بھرتے نہیں
موت کے دیے ہوئے تحفے
زمین اپنا پیٹ بھرنے کے لیے
بخوشی قبول کر لیتی ہے
مگر ہم
اس کے پھولے پیٹ کی رسولیوں کو
قبریں بنا لیتے ہیں
اور ان پر کہیں کتبے نہیں ہوتے
خودرو گھاس ہوتی ہے
جس کا کوئی نام نہیں ہوتا

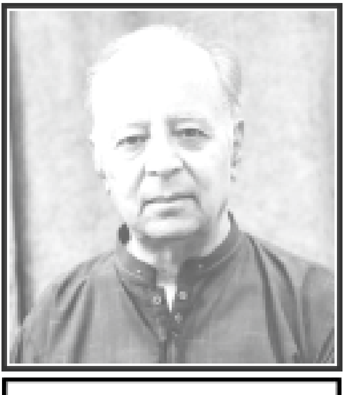

سمیع اللہ عرفی

کھرچن (نثری نظم)

دکھ کی
کھردری کھال میں
غم کی چربی
قہقہوں سے پناہ چاہتی ہے

میں روز کھرچتا ہوں
تاکہ نیچے تک پہنچ سکوں
جہاں اصل میں
میں پڑا ہوں

ہر خراش پر
تمھارا نام
نجانے کتنے رنگوں میں لکھا
مجھے گھورتا ہے

اگر یہاں کچھ نہیں ہے
نہ نام، نہ چہرہ
صرف اندھیرا ہے
جسے میں اصل سمجھتا رہا
تو
اس اندھیرے میں
کون تھا
جو ابھی بھی
میرے نام کے ساتھ
چل رہا ہے

امجد بابر

سمے کا بندھن (نثری نظم)

تمھارے سامنے میرے تمام لفظ
ادھورے ہی ادا ہو پاتے ہیں
تم میرے جملوں کو کوئی مفہوم پہنا دو
انکے معنی تمھاری اس لمحے کی سوچ سے
وابستہ ہوتے ہیں
میں نے خامشی کا جو لبادہ اوڑھ رکھا ہے
اس کے پیچھے ادھورے جوابوں کی
سسکیاں گونجتی ہیں
جنھیں تمھاری سماعتیں سن نہیں پاتیں
تم نے زندگی کی دوڑ میں ابھی کمند بھری ہے
اور مجھے زندگی نے گزارا ہے
میں خامشی سے گزرتے وقت کے ساتھ
لمحہ لمحہ تنہائی کی انگشت پکڑے
ابدیت کے سفر پر رواں ہوں
بولتے ہوئے لفظ ہکلاتے ہیں اور جملے
زبان کا ساتھ نہیں دے پاتے
آنکھیں پلکیں اوڑھے رہتی ہیں
لب خاموش ہوں تو
دل آنکھوں سے چھلکنے لگتا ہے
مجھے کب تک اس راستے پر رکنا ہے
اسکا مقام اور وقت طے ہے
میں تو اسٹیشن پر بیٹھا وہ مسافر ہوں جسکی
ٹرین چھوٹ جائے
اور اگلی ٹرین کے آنے تک
وہ اجنبیت اوڑھے رستوں پر نظریں جمائے
نادیدہ اشاروں کا منتظر رہتا ہے
کب سفر شروع ہو کب تمام یہ
بخت طے کرے گا
خامشی اسکی لائف لائن ہے
جو اسے سمے کے سمندر میں
ڈوبنے سے بچائے ہوئے ہے

نائلہ راٹھور

میں تم ـــــ اور ڈھیروں کتابیں (نثری نظم)

کمرے کے کونے میں رکھی وہ لکڑی کی الماری
جس میں وقت سانس لیتا ہے
اور لفظ،
خاموشی میں بھی بولتے رہتے ہیں
میں نے تمہیں پہلی بار
کسی ناول کے صفحے کے بیچ رکھا تھا
جہاں محبت
ایک ادھوری سطر کی طرح ٹھہری ہوئی تھی
تم نے مسکرا کر
میرے ہاتھ سے کتاب لی
اور کہا ـــــ
" کہانیاں صرف پڑھی نہیں جاتیں،
جی بھی جاتی ہیں"
پھر ہم دونوں
لفظوں کے درمیان چلنے لگے
جہاں ہر جملہ
ایک نیا راستہ کھولتا تھا
کبھی تم
میرے پسندیدہ شعر کی طرح نرم ہو جاتے
اور میں
کسی پرانی کہانی کی طرح تم میں کھو جاتا
کتابیں
ہماری گواہ تھیں
کہ ہم نے وقت کو
سیاہی میں قید کرنے کی کوشش کی تھی
مگر وقت ـــــ
وہ تو تمہاری آنکھوں میں بہتا رہا
اور میں
ہر صفحہ پلٹتے ہوئے
تمہیں دوبارہ پڑھتا رہا
اب بھی
جب میں اکیلا ہوتا ہوں
اور کتاب کھولتا ہوں
تو لفظوں کے بیچ
تمہاری خوشبو اتر آتی ہے
میں، تم
اور ڈھیروں کتابیں ـــــ
شاید محبت کا یہی مطلب ہے
کہانی ختم بھی ہو جائے
مگر احساس
ہمیشہ ادھورا رہے۔

زریاب گل

دعائیہ (محمد سلیم طاہر کے لیے)

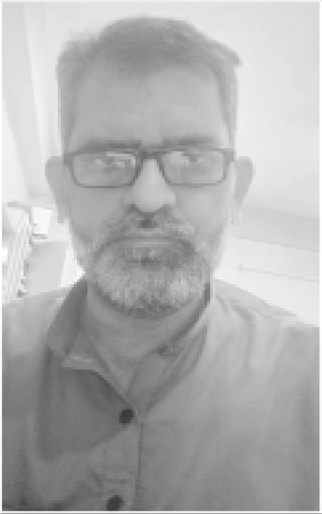

یا رحمن یا رحیم یا کریم
یا رب العالمین
یا اکرم الاکرمین

صدقہ محمد الرسول اللہ و آلِ محمدؐ
تا حشر منور رہے تربت محمد طاہر سلیم
اردو ادب کے قلمکار
شعری دنیا کو نئی منزلیں دکھانے والے
جگمگ جگمگ، جھلمل جھلمل اسکرین پر
کارہائے نمایاں انجام دیئے

غم خوار تھے اپنوں کے
دوستوں کی رفاقت کو رکھتے عزیز
ذاتی مفاد سے بے خبر
شہر بھر سے گلاب چُن کر
بٹھاتے اپنے قریب

صبر و قناعت کے پیکر
ہر لمحہ زبان پر وردِ رب کریم

التجا ہے ربِ رحیم (مرحوم) کی تمام لرزشوں سے
درگزر فرما کے ہمیشہ اپنے جوارِ رحمت میں رکھنا
پسماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ
صحت و تندرستی عطا فرما
اور ہم سب کو اپنی اطاعت و شکر گزاری نصیب فرمانا

محمد عبداللہ

کس نے پیار نبھایا ہے! (نثری نظم)

روک دیا ہے اپنے آنسوؤں کو

خوف زدہ ہوں

کہیں میرے دل کا حال سب پر افشا نہ ہو جائے

میری چاہت میرے اندر سلگ رہی ہے

لیکن یہ بھی ڈر ہے مجھ کو

اندر ہی اندر میں جل کر راکھ نہ ہو جاؤں

شاید اس لیے میں خوش خوش

دکھائی دیتا ہوں

جانتا ہوں میرے اندر کے زخموں کا مرہم

کسی کے پاس نہیں

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ، نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

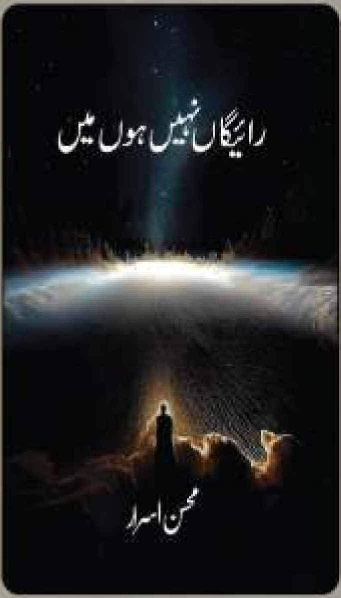
رائیگاں نہیں ہوں میں
محسن اسرار

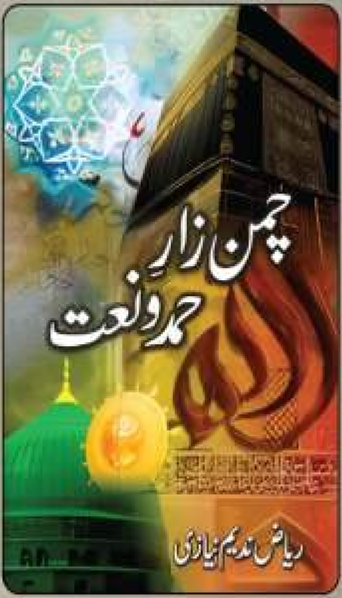
چمن زارِ
حمد و نعت
ریاض ندیم نیازی

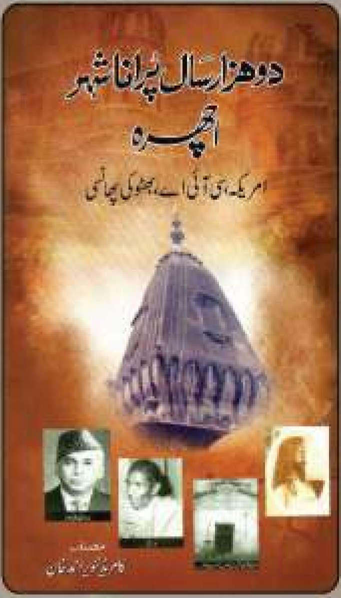
دو ہزار سال پرانا شہر
اچھرہ
امریکہ، سی آئی اے، بھٹو کی پھانسی

نہایت
منظر اعجاز

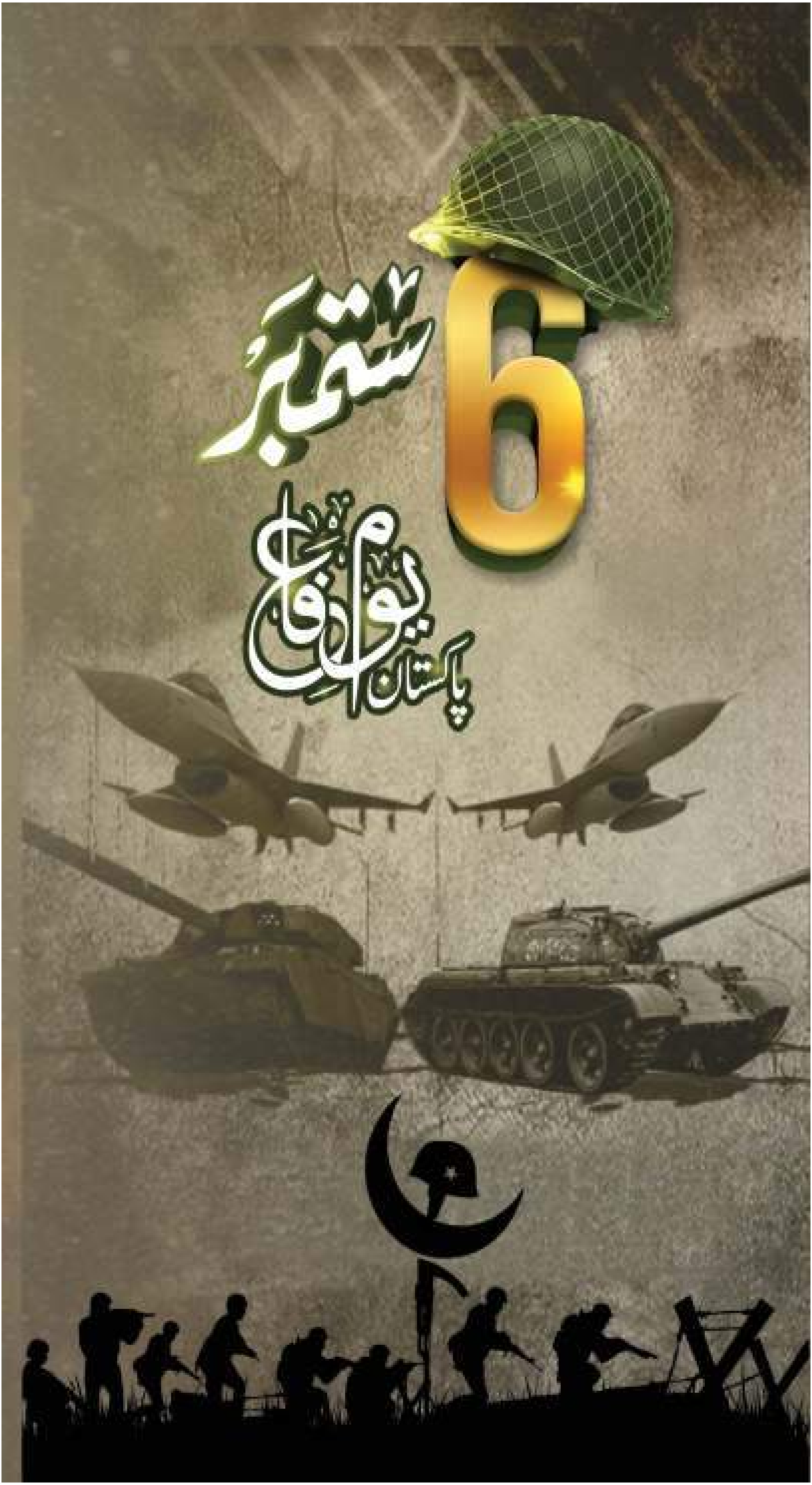
6 ستمبر
یومِ دفاعِ پاکستان